جہاد بالقرآن اور اس کے پانچ محاذ

ڈاکٹر اسرار احمد

ترتیب و تسوید:

شیخ جمیل الرحمٰن

مکتبہ خدام القرآن لاھور

36۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور فون:03-35869501

www.tanzeem.org

پیش لفظ (طبع اوّل)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن و امیر تنظیم اسلامی نے جہاد، حقیقتِ جہاد، غایتِ جہاد اور دین میں جہاد کے مقام کے موضوعات پر متعدد تقاریر کی ہیں۔ مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے حصہ چہارم میں ''تواصی بالحق'' کے عنوان کے ذیل میں سورۃ الحج کا آخری رکوع، سورۃ الصّف (مکمل)، سورۃ الجمعۃ (مکمل)، سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ اور سورۃ المنافقون (مکمل) شامل ہیں، جن پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے متعدد دروس دیے ہیں، جن میں جہاد کی اہمیت و فرضیت پر سیر حاصل بحث ہوئی ہے۔

اس عاجز کی معلومات کی حد تک سورۃ الفرقان کی آیت ۵۲ کی روشنی میں ''جہاد بالقرآن'' کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کا یہ پہلا مفصل خطاب ہے جو موصوف نے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے چھٹے سالانہ محاضراتِ قرآنی کے افتتاحی اجلاس منعقدہ ۲۵/مارچ ۱۹۸۴ء میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت برعظیم پاک و ہند کی مشہور و معروف دینی و علمی شخصیت جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ العالی مدیر ماہنامہ برہان دہلی، مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند (بھارت) کے رکن، شیخ الہندؒ اکیڈمی (بھارت) کے ڈائریکٹر نیز مدرسہ عالیہ کلکتہ (بھارت) کے سابق پرنسپل اور متعدد دینی و علمی اور تحقیقی کتب کے مصنف و مؤلف نے فرمائی تھی۔ علاوہ ازیں اس اجلاس میں ملک کے بعض جید علماء عظام اور دانشوران کرام بھی شریک تھے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ خطاب انتہائی پُرتاثیر، نہایت مدلل اور خطابت کی معراج تھا۔ کسی تقریر، خطاب یا درس کو ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا کافی مشکل کام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے یہ کام انجام پاتا ہے۔ لیکن تحریر میں مقرر کا زورِ خطابت، الفاظ کی ادائیگی کا زیروبم، اس کی اپنی شخصیت کا اثر، دورانِ تقریر الفاظ کی ادائیگی کا خاص طرز اور ان پر زور، ہاتھوں کی حرکات و سکنات کا انداز اور مجموعی طور پر ان سب کا سامعین پر جو گہرا تأثر قائم ہوتا ہے، اسے تحریر میں سمونا ممکن نہیں ہے۔ آڈیو کیسٹ کی سماعت سے بعض باتوں کی کچھ نہ کچھ تلافی ضرور ہوتی ہے، البتہ ویڈیو کیسٹ بڑی حد تک ان سب کا بدل ہو سکتا ہے، لیکن افسوس کہ اس خطاب کے ویڈیو کیسٹ تیار نہ ہو سکے۔

بہرحال اس عاجز کی ناچیز رائے میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ خطاب ان کے بہترین خطابات

میں سے ایک ہے اور ع ''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے'' کا مرقع۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ع ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی''......ڈاکٹر صاحب موصوف نے قرآن مجید میں غوطہ زن ہو کر اس بحرِ بے کنار میں سے معارف و عرفان اور حکم و عبر کے کچھ درِ شہسوار نکالے ہیں جو اس خطاب میں آپ کو نظر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کے بارے میں سچ فرمایا تھا الصادق المصدوق ﷺ نے: ((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ)) ''علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہو سکیں گے، نہ کثرتِ تکرار سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم و معارف و بصائر کے خزانے) کبھی ختم ہو سکیں گے''۔

محاضراتِ قرآنی کے بعد رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ (جون ۱۹۸۴ء) کے دو اجتماعاتِ جمعہ میں مسجد دارالسلام لاہور میں ''جہاد بالقرآن'' کے موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب نے دو خطابات مزید ارشاد فرمائے تھے۔ گویا جو کلی ۲۵ مارچ کو کھلی تھی اس نے شگفتہ پھول کی شکل اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ ان میں سے آخری خطاب کا عنوان تھا: ''جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ''...... یہ خطاب بھی اس عاجز نے کیسٹ سے منتقل کر لیا تھا اور اب اسے بھی معمولی حک و اضافہ کے بعد اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔

یہ دونوں خطابات محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کی نظر ثانی کے بغیر شائع کیے جا رہے ہیں۔ البتہ ان میں سے دوسرے خطاب (جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ) پر قرآن اکیڈمی کے فیلو حافظ خالد محمود خضر نے نظر ثانی کر کے اسے مزید بہتر بنانے میں تعاون فرمایا ہے۔ جَزَاهُ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْجَزَاءِ۔ ان میں جو صواب ہے وہ من جانب اللہ ہے اور اگر کوئی خطا ہے یا اظہارِ مدعا میں کوئی تقصیر ہے تو اس کی ذمہ داری اس عاجز کے ناتواں کاندھوں پر ہے، جس کے لیے یہ عاجز بارگاہِ رب العزت میں دست بدعا ہے: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

مزید دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو حسنِ نیت، حسنِ عمل اور اپنے دین حق کا صحیح فہم نیز اس کی صحیح خدمت کی توفیق و سعادت سے بہرہ ور فرمائے، ڈاکٹر صاحب موصوف کی مساعیٔ جمیلہ و جلیلہ کو دنیا و آخرت میں مشکور فرمائے، نیز اس عاجز کی جانب سے اس کام میں اس حقیر سے تعاون کو اس کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ۔ آمِيْنَ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ!!

احقر جمیل الرحمٰن عفی عنہ

۱۰/ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ

عنوانات

☆☆☆

☆☆☆

جہاد بالقرآن

الحمد للہ وکفی والصلوۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی ...... امّا بعد:

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ــ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿فَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِيۡنَ وَجَاهِدۡهُمۡ بِهٖ جِهَادًا كَبِيۡرًا﴾ صدق اللہ العظیم

خطبۂ مسنونہ ' تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

جس آیتِ مبارکہ کی میں نے تلاوت کی ہے' اس میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں۔ ایک لفظ ''جہاد'' جو اِس آیتِ مبارکہ میں دو مرتبہ آیا ہے' ایک فعل امر کے طور پر ''جَاهِدۡ'' اور دوسرے مفعول مطلق کے طور پر ''جِهَادًا كَبِيۡرًا ''۔ یعنی نہ صرف جہاد بلکہ شدید جہاد' بہت بڑا جہاد۔ یہاں دوسرا اہم لفظ ''بِهٖ '' آیا ہے۔ اس آیت میں حکم دیا جارہا ہے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو: ﴿وَجَاهِدۡهُمۡ بِهٖ جِهَادًا كَبِيۡرًا﴾ ''آپؐ ان سے جہاد کیجیے اس (قرآن) کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد''۔

یہاں ''بِهٖ '' کا جو چھوٹا سا ٹکڑا آیا ہے' میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اکثر و بیشتر ہمارے اہلِ علم حضرات بھی اس کی اہمیت پر غور و فکر کیے بغیر سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جہاں بھی قرآن کے لیے ''بِهٖ '' بطور ضمیر مجرور آیا ہے' ہمارے اہلِ علم' الاّ ماشاء اللہ' اس کا حق ادا نہیں کرتے۔

اس ''بِهٖ '' کی اہمیت کے اظہار کے لیے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

پہلی مثال سورۂ بنی اسرائیل سے ہے' جہاں فرمایا: ﴿وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ‌ۖ﴾ ''اور (اے نبیؐ!) کچھ رات جاگتے رہیے اس (قرآن) کے ساتھ' یہ بڑھوتری ہے آپؐ کے لیے''۔ میرا اندازہ ہے کہ تہجد کی فضیلت' اس کی اہمیت اور اس کا مقام و مرتبہ تو ہمارے یہاں معروف اور مشہور ہے' کسی کو اس کی توفیق ملی ہو یا نہ ملی ہو' لیکن

اس کی عظمت اور برکات سے ہر وہ مسلمان بخوبی واقف ہوگا جس کا تھوڑا بہت بھی دینی مزاج ہے۔لیکن یہاں بھی ''بِــہٖ'' پر اتنی توجہ نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہیے۔تہجد میں اہم ترین شے قیام' وہ بھی طویل قیام' اور اس میں ترتیل کے ساتھ تلاوتِ قرآن ہے:

﴿یٰـاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّیْلَ اِلاَّ قَلِیْلاً ۝ نِّصْفَہٗ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلاً ۝ اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلاً ۝﴾ (المزّمل)

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو' مگر کم' آدھی رات' یا اس سے کم کرلو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھادو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔''

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں عموماً وہ عام نوافل کی طرح آٹھ رکعتیں پڑھ لیتے ہیں' پھر بیٹھ کر مختلف اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں اور زیادہ وقت اس میں صرف کرتے ہیں (الاّ ماشاء اللہ)۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے' لیکن اس کی برکات سے کماحقہٗ استفادہ تب ہوگا جب اِس میں طویل قیام ہو اور اس میں ترتیل کے ساتھ قرآنِ مجید کی تلاوت ہو۔

دوسری مثال سورۂ مریم کی ہے' جہاں فرمایا:

﴿فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰـہُ بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَ بِہِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِہٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝﴾

''پس یقیناً (اے نبیؐ!) اس کلام کو ہم نے تمہاری زبان میں آسان کر کے نازل کیا ہے' تاکہ تم اس (قرآن) کے ذریعے پرہیز گاروں کو خوشخبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو اس کے ذریعے سے خبردار کرو۔''

یہاں بھی غور فرمایئے کہ تبشیر و انذار کے لیے قرآن مجید ہی کو ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔لیکن ہوتا کیا ہے! یہ کہ ہمارے یہاں وعظوں اور خطبوں میں اکثر و بیشتر یہ کام اولیاء اللہ کے تذکروں یا مولانا رومؒ کی مثنوی سے لیا جاتا ہے۔قرآن کی طرف بہت ہی کم توجہ دی جاتی ہے۔بعینہٖ یہی معاملہ زیرِ نظر آیتِ کریمہ کا ہے: ﴿وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا﴾ معلوم ہوا کہ یہاں جس جہاد کا حکم دیا جا رہا ہے اس شدّ و مدّ کے ساتھ' اس اہتمام کے ساتھ' اس تاکید و زور (emphasis) کے ساتھ' تو اس کے لیے ایک ذریعہ' ایک آلہ' ایک ہتھیار ہے جو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوا ہے۔اس کے لیے بھی ایک تلوار ہے جو آپؐ کے دستِ مبارک میں تھمائی گئی ہے اور وہ ہے قرآن حکیم۔لہٰذا ارشاد ہوا: ''اور (اے نبیؐ!) ان (مشرکین و کفار) کے ساتھ جہاد کیجیے اس (قرآن) کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد''۔

جہاد اور قرآن: دو مظلوم ترین حقیقتیں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل یہاں لفظ ''جہاد'' کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔پہلی بات یہ کہ میرے نزدیک جہاد ہمارے دین کا مظلوم ترین تصور (concept) ہے۔مظلوم ہونے کے اعتبار سے اس کے ہم پلہ دوسری شے جو آتی ہے وہ قرآن ہے۔ہمارے دین کی یہ دو مظلوم ترین حقیقتیں ہیں۔جہاد کے بارے میں اتنے مغالطے ذہنوں میں ہیں کہ حد و شمار نہیں۔پھر خاص طور پر ہماری تاریخ میں ایک دور وہ بھی آیا کہ جب ہم براہِ راست محکوم ہوئے' نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہنی وفکری اعتبار سے بھی۔یعنی ہم دوطرفہ غلامی کے پنجے میں گرفتار ہوئے۔اُس وقت اہلِ مغرب کی طرف سے ہم پر جہاد کے حوالے سے بڑے جارحانہ حملے ہوئے اور استہزاء و تمسخر کا معاملہ ہوا۔انہی کا یہ الزام ہے کہ: ع ''بوئے خوں آتی ہے اِس قوم کے افسانوں سے!'' چنانچہ اس ضمن میں ہمارا انداز معذرت خواہانہ (apologetic) رہا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اب یہ دَور اصلاً گزر چکا ہے' لیکن تاحال اس کے باقیات السّیِّئات کچھ لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں' اور جب تک ہم اُن کو اچھی طرح کھرچ نہیں دیں گے اُس وقت تک دین کی کوئی مثبت' پائیدار اور فعال تحریک جو نتیجہ خیز بھی ہو' اٹھانا ممکن نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ جہاد کے بارے میں سب سے پہلا مغالطہ ذہنوں میں یہ بٹھا دیا گیا اور اس کے نتائج بہت دُوررس ہیں کہ جہاد کے معنی ''جنگ'' ہیں۔اس بارے میں میری رائے ہے کہ اغیار اور بیگانوں کی کارستانی کے ساتھ ساتھ یگانوں اور اپنوں کی بھی غلطیاں ہیں۔اپنوں کی بڑی اکثریت نے بھی جہاد کو ''جنگ'' ہی قرار دیا جب کہ

قرآن مجید مستقل طور پر دو اصطلاحات استعمال کرتا ہے' ایک ''جہاد فی سبیل اللہ'' اور دوسری ''قتال فی سبیل اللہ''۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر ہمارے دینی لٹریچر میں جنگ کے تمام مدارج و مراحل کے لیے بطورِ عنوان لفظ جہاد استعمال ہو جاتا ہے اور جنگ کو ''جہاد'' ہی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہوتے ہوتے ہمارے ذہنوں میں جہاد اور قتال مترادف کی حیثیت سے جاگزیں ہو گئے اور عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ جہاد کے معنی جنگ ہیں۔

تیسری بات یہ کہ ظاہر ہے جنگ ہر وقت اور ہمیشہ تو نہیں ہوتی' لہٰذا جہاد فرضِ کفایہ رہ گیا اور فرضِ عین کی فہرست سے خارج ہو گیا۔ جب کبھی جنگ کا مرحلہ آتا تھا تو جتنی نفری کی ضرورت ہوتی تھی وہ نکل آتی تو بقیہ لوگوں کی طرف سے وہ فرض ادا ہو جاتا تھا۔ یہی فرضِ کفایہ کا تصور ہے اور بالکل صحیح تصور ہے۔ لیکن جہاد و قتال کو مترادف سمجھ لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے یہاں جو فقہی تصورات و معیارات اور سوچ کے جو پیمانے ہیں ان میں جہاد گویا صفِ اوّل کی شے رہا ہی نہیں۔ اس کا فرضِ عین ہونا پس منظر میں چلا گیا' حتیٰ کہ ذہنوں سے اوجھل اور محو ہو گیا۔ اِلاّ ماشاء اللہ!

چوتھی بات یہ کہ اس پر ستم بالائے ستم اور بناء الفاسد علی الفاسد یہ ہوا کہ ہم نے یہ تصور کر لیا کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے تو گویا وہ جہاد فی سبیل اللہ کر رہا ہے۔ حالانکہ ایک مسلمان ذاتی حیثیت سے جہاں فاجر و فاسق ہو سکتا ہے وہاں ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا کوئی بادشاہ یا کوئی سربراہ یا کوئی گروہ ظالم بھی ہو سکتا ہے اور ایک ناحق جنگ بھی شروع کر سکتا ہے' صرف اپنے مفادات کے لیے' صرف اپنے اقتدار کو وسعت دینے کے لیے' اپنی حدودِ سلطنت کی توسیع کے لیے' جبکہ اُن کے پیشِ نظر دین کی کوئی خدمت نہ ہو' اعلائے کلمۃ اللہ کا کوئی مقصد نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی جنگ جہاد یا قتال فی سبیل اللہ کیونکر شمار ہو جائے گی' جبکہ ہمارے سامنے نبی اکرم ﷺ کی یہ واضح حدیث موجود ہے:

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اَلرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِیُرٰی مَکَانُہٗ فَمَنْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ؟ قَالَ: ((مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا' اس نے دریافت کیا کہ حضور! ایک شخص جنگ کرتا ہے مالِ غنیمت کے لیے' ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنے ذکر اور شہرت کے لیے اور ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنی (یا اپنے قبیلہ کی) سربلندی دیکھنے کے لیے' تو کس کی جنگ اللہ کے راستے میں ہو گی؟ حضورؐ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا: ''صرف اس کی جنگ فی سبیل اللہ ہو گی جو اس لیے جنگ کرے تاکہ اللہ کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے۔''

خیال رہے کہ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ تو قتال فی سبیل اللہ وہ جنگ ہے جو اللہ کے جھنڈے کی سربلندی کے لیے کی جائے' نہ کہ ہر مسلمان کی یا مسلمانوں کی حکومت کی ہر نوع کی جنگ جہاد و قتال فی سبیل اللہ قرار دی جائے گی۔ بہرحال یہ ہیں وہ مغالطے جو کچھ تو اغیار کی کرم فرمائی سے اور کچھ اپنوں کی ستم ظریفی سے تہہ در تہہ ذہنوں میں بیٹھ گئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تصور کو نکھار کر سامنے لایا جائے کہ جہاد فی سبیل اللہ درحقیقت ہے کیا' اور جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ میں فرق کیا ہے!

میں نے اس پر بہت غور کیا کہ ایک عام اردو دان کے لیے وہ لفظ کون سا ہو گا جو لفظ جہاد کے مفہوم کو صحیح صحیح ادا کر دے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ لفظ جہاد بابِ مفاعلہ سے ہے اور بابِ مفاعلہ کے اکثر مصادر میں فریقین کی شرکت ہوتی ہے۔ پھر ایک دوسرے پر غالب آنے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہوتا ہے' جیسے بحث سے مباحثہ' جہد سے مجاہدہ اور جہاد' اور قتل سے مقاتلہ اور قتال۔ قتال میں بات دوطرفہ ہو جاتی ہے جبکہ قتل یک طرفہ عمل ہے۔ کوئی شخص جا رہا ہے' کسی نے گولی مار دی یا خنجر گھونپ دیا درآنحالیکہ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ یہ حادثہ ہو جائے گا' یہ قتل ہے۔ لیکن جب دو فریق آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہو جائیں تو یہ ان فریقین کے مابین قتال یا مقاتلہ ہے۔ اسی طرح جہد کا عمل ہے۔ یہ عام فہم لفظ ہے اور

اردو میں کوشش کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس سے جہاد و مجاہدہ کے معنی و مفہوم ہوں گے کوششوں کا تصادم، کوششوں کا ٹکراؤ، کوششوں کا مقابلہ۔ جس کے لیے ایک لفظ ہوگا ''کشمکش'' یا ''کشاکش''۔ انگریزی میں اسے کہیں گے: struggle۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے بعد صلہ (preposition) کے طور پر against کا لفظ آتا ہے۔ یعنی کوئی رکاوٹ ہے، کوئی چیز درمیان میں راستہ روکنے والی ہے تو اسے ہٹانے اور دُور کرنے کے لیے اس سے کشمکش کرنا۔ درحقیقت جہاد یا مجاہدہ کا صحیح صحیح لغوی مفہوم یہی ہے۔

فرائضِ دینی اور جہاد کی منازل

میں اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے اپنے غور وفکر کے نتائج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس مسئلہ پر غور وفکر کے نتیجے میں جہاد کے تین بڑے بڑے درجے اور ہر درجہ کے تین پہلو یا تین قسمیں میرے سامنے آئی ہیں۔ میں ان کو اہلِ علم کے سامنے ان کی تائید وتوثیق یا اصلاح کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں، مجھے اہلِ علم کی رہنمائی حاصل ہونے پر دلی مسرت ہوگی۔ میں خلوصِ دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھ پر میری غلطی واضح کر دی جائے تو میں سرِتسلیم خم کرنے میں ایک لمحہ کے لیے بھی تردّد نہیں کروں گا، بلکہ غلطی کی نشاندہی کرنے والے صاحب کا صمیم قلب سے احسان مند ہوں گا۔

میرے نزدیک یہ تین بڑے بڑے درجے ان بنیادی فرائض سے متعلق ہیں جو ہمارا دین اپنے ماننے والوں پر عائد کرتا ہے۔ دین کی طرف سے ہر مسلمان پر جو تین بنیادی فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی بنیادی تفہیم کے لیے ایک تین منزلہ عمارت کی تمثیل یا تشبیہہ بہت ہی مفید ہے۔

پہلی منزل: عبادتِ ربّ

فرائض دینی کی پہلی منزل ہے خود اللہ کا بندہ بننا۔ اور یہ بندگی ہمہ وجوہ، ہمہ تن اور ہمہ وقت ہوگی، جزوی نہیں ہوگی۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (البقرۃ:۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے''۔

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَاَنِیْبُوْۤا اِلٰی رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ B﴾ (الزمر)

''اور اپنے ربّ کی طرف رجوع کرو اور اس کی فرمانبرداری قبول کر لو (اس کے سامنے سرِتسلیم خم کر دو) اس سے پہلے پہلے کہ تم پر عذاب آ جائے، پھر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔''

اس رویہ کا دینی اصطلاح میں نام ہے اسلام، سرِتسلیم خم کرنا، گردن نہادن، to surrender۔ اسی کے لیے مزید دو اصطلاحات ہیں: اطاعت اور تقویٰ۔ اطاعت کا مفہوم ہے مقاومت و مدافعت ترک کر کے برضا وخوشی فرمانبرداری قبول کر لینا، جس کے لیے قرآن مجید میں بار بار حکم دیا گیا: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی''۔ اسے انگریزی میں یوں کہیں گے:

"To give up all kinds of resistance whole heartedly."

یعنی ''خوش دلی سے ہر نوع کی مقاومت و مزاحمت ترک کر دینا''

جبکہ ''تقویٰ'' کا مفہوم ہے اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا، اس کی نافرمانی سے باز رہنا۔ تقویٰ کا حکم قرآن مجید میں بڑی تکرار اور تاکید سے آیا ہے۔ اس ضمن میں چوٹی کی آیت ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ x﴾ (آل عمران)

''اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور تم پر موت نہ آئے مگر حالت فرمانبرداری میں۔''

اطاعت اور تقویٰ میں بالترتیب مثبت اور منفی رویہ سامنے آتا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ گویا ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

اس پہلی منزل کے لیے چوتھی اور آخری جامع ترین اصطلاح ہے ''عبادت''۔ اس میں اسلام' اطاعت اور تقویٰ کے تمام مفاہیم آ جاتے ہیں۔ اس لفظِ عبادت کے سمجھنے کے لیے فارسی کے دو الفاظ کو جو اردو میں مستعمل ہیں' جمع کریں گے تو مفہوم ذہن نشین ہو جائے گا۔ وہ الفاظ ہیں ''بندگی'' اور ''پرستش''۔ بندگی غلامی کو کہتے ہیں۔ اس میں اطاعت کا پہلو غالب ہے' جبکہ پرستش کے معنی ہیں مخلصانہ اور والہانہ محبت۔ سورۃ الزمر میں نبی اکرمﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝﴾ ''پس (اے نبیؐ!) اللہ کی بندگی کیجیے اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے''۔ پھر سورۃ البیّنۃ میں ان دونوں کو نہایت حسین وجمیل اسلوبِ بیان میں بایں طور جمع کر دیا گیا: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ......﴾ (آیت ۵) ''اور اُن کو اِس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین (اطاعت) کو اس (اللہ تعالیٰ) کے لیے خالص کرتے ہوئے' بالکل یکسو ہو کر''۔ قرآنِ مجید میں جن و اِنس کی تخلیق کی غایت یہی عبادتِ ربّ قرار دی گئی ہے' از روئے آیت مبارکہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝﴾ (الذّٰریٰت) ''میں نے جنوں اور انسانوں کو فقط اپنی بندگی کے لیے تخلیق کیا ہے''۔

فرائض دینی کی اس پہلی منزل کو سر کرنے کے لیے ایک بندۂ مؤمن کو سہ گونہ جہاد کرنا پڑے گا' یعنی مجاہدہ و کشمکش کرنی پڑے گی۔

پہلی منزل کے تین جہاد

اس پہلی منزل پر سب سے پہلے کشمکش کرنی پڑے گی اپنے نفس سے۔ نفس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف: ۵۳) ''یقیناً نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے''۔ ''اَمَّارَة'' اَمر سے مبالغہ کا صیغہ ہے' یعنی بہت ہی زیادہ اکسانے والا' نہایت سختی سے حکم دینے والا۔ لہٰذا اللہ کا بندہ بننے کے لیے پہلی کشمکش خود اپنے نفس کے ساتھ کرنی پڑے گی۔ ایک حدیث میں نفس کے خلاف جہاد کو ایک اعتبار سے ''افضل الجہاد'' قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى))[1] ''افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے ان کے خلاف جہاد کرو''۔ حضرت فضالہ بن عبید ؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ))[2] ''اصل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے''۔ پس پہلی کشمکش ہر اُس شخص کو اپنے نفس سے کرنا ہو گی جو واقعتاً اللہ کا بندہ بننا چاہتا ہے۔ اسی نفس کے متعلق مولانا رومؒ نے کیا خوب بات کہی ہے:

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیکن اُو را عون ایں را عون نیست!

یعنی میرا یہ نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ فرعون کے پاس لاؤ لشکر تھا لیکن اس کے پاس لاؤ لشکر نہیں ہے' ورنہ میرا نفس اندر سے وہی کچھ دعویٰ کر رہا ہے جو فرعون نے کیا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا ملکِ مصر کے بارے میں: ﴿اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ﴾ (الزخرف: ۵۱) ''کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں ہے؟'' اسی طرح میرا نفس میرے وجود پر حکومت کا دعوے دار ہے۔ پس سب سے پہلا اور سب سے بڑا جہاد ''مجاہدہ مع النفس'' ہے۔ جس نے اس منزل کو سر نہیں کیا اور وہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے تو میرے نزدیک اس کے لیے ہلکے سے ہلکا لفظ ''حماقت'' ہے۔

نفس امّارہ کو تقویت دینے کے لیے ایک طاقت موجود ہے' وہ ہے شیطانِ لعین اور اس کی صلبی و معنوی ذریت۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اِس نفس کو تقویت پہنچائے' اس

---

(۱) رواہ الدیلمی' بحوالہ کنز العمال ۲۶۹/٤۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب فضائل الجہاد۔

میں پھونکیں مارے اور اس میں جتنے بھی سفلی محرکات ہیں انہیں مشتعل کرے۔ ایک حدیث کی ابتدا میں الفاظ آتے ہیں:

((اِنَّ اِبْلِیْسَ لَہٗ خُرْطُوْمٌ کَخُرْطُوْمِ الْکَلْبِ وَاضِعُہٗ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ یُذَکِّرُ الشَّھَوَاتِ وَاللَّذَّاتِ وَیَاْتِیْہِ بِالْاَمَانِیِّ وَیَاْتِیْہِ بِالْوَسْوَسَۃِ عَلٰی قَلْبِہٖ لِیُشَکِّکَہٗ فِیْ رَبِّہٖ))

''ابلیس کی بھی تھوتھنی ہے کتے کی تھوتھنی کی طرح۔ وہ اسے ابن آدم کے دل پر رکھ دیتا ہے اور اسے خواہشاتِ نفس اور مرغوب چیزوں پر اُبھارتا ہے' وہ اس کو لمبی لمبی امیدیں (wishful thinking) دلاتا اور اس کے دل میں وسوسے پیدا کرتا ہے' تاکہ اسے اپنے ربّ کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کردے''۔

ایک اور متفق علیہ حدیث ہے:

((اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ))(۱)

''شیطان انسان کے اندر خون کی مانند دوڑتا ہے''۔

قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے بے شمار مقامات پر شیطان کے اغوا اور فریب سے خبردار اور متنبہ کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا: ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا﴾ (فاطر:٦) ''(لوگو!) یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے' پس تم بھی اسے دشمن سمجھو (دشمن جانو)''۔ اور سورۃ الکھف میں بڑا پیارا انداز ہے' جس میں ایک لطیف سا طنز بھی موجود ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ ط اَفَتَتَّخِذُوْنَہٗ وَذُرِّیَّتَہٗٓ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَھُمْ لَکُمْ عَدُوٌّ ط بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾﴾

''اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ وہ جنوں میں سے تھا' سو اُس نے اپنے ربّ کے حکم سے روگردانی کی۔ کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت (صلبی ومعنوی) کو اپنا دوست بناتے ہو؟ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ ایسے ظالموں کے لیے بہت ہی برا بدلہ ہے''۔

چنانچہ کشمکش کرنا ہوگی' مجاہدہ کرنا ہوگا شیطان اور اس کی صلبی ومعنوی ذریت کے ساتھ اور اس کو شکست دینا ہوگی۔ اس لفظ ''شکست'' سے میرا ذہن اچانک علامہ اقبال کے فارسی کلام میں اُن کی نظم ''نالۂ ابلیس'' کی طرف منتقل ہوا جو مجھے بہت پسند ہے۔ شیطان اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے کہ پروردگار! یہ انسان تو میری چوٹ کا نہیں' میرے مقابلے کا نہیں' ایک مشتِ خس ہے جس کے لیے میری ایک چنگاری کافی ہے۔ اس انسان کو اگر سوکھی گھاس ہی بنانا تھا تو مجھ میں اس قدر تیز وتند آگ رکھنے کا کیا فائدہ ہوا!

ابنِ آدم چیست؟ یک مشتِ خس است! ۔۔۔ مشتِ خس را یک شرار از من بس است

اندریں عالم اگر جز خس نبود ۔۔۔ ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود؟

نظم کا آخری شعر تڑپا دینے والا ہے ؎

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست ۔۔۔ لذتے شاید کہ یابم در شکست!

''الٰہی! کوئی تو زندہ مردِ حق پرست ایسا ہو جو مجھے شکست دے دے' تاکہ میں بھی تو کبھی شکست کا لذت آشنا ہوسکوں''۔

تو دوسری کشمکش اور دوسرا مجاہدہ یہ ہوگا۔

تیسری کشمکش ایک بگڑے ہوئے معاشرے کا جو سماجی دباؤ (social pressure) ہے' اس سے ہوگی۔ معاشرے کا دباؤ آپ کو ایک خاص رُخ پر دھکیلے گا۔ اس لیے کہ ایک ہجوم جس سمت میں جا رہا ہو اُس سمت میں چلنا بہت آسان ہے۔ آپ کو کوئی زور نہیں لگانا پڑے گا' وہ آپ کو خود دھکیل کرلے جائے گا۔ ع

''زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز!''

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتکاف' باب زیارۃ المرأۃ زوجھا فی اعتکافہ۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری میں یہ حدیث متعدد مقامات پر الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ متعدد طرق سے وارد ہوئی ہے۔ وصحیح مسلم' کتاب السلام' باب بیان انہ یستحب لمن رؤی خالیا بامرأۃ وکانت زوجتہ او محرما لہ ان یقول: ھذہ فلانۃ' لیدفع ظن السوء بہ۔ وسنن ابی داؤد' کتاب الصیام' باب المعتکف یدخل البیت لحاجتہ۔

''زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو تم اس کے ساتھ موافقت کرلو!''

اس طرح کوئی تصادم نہیں ہوگا' کوئی کشمکش نہیں ہوگی' کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔ دُنیوی نقطۂ نظر سے عافیت اسی میں ہے' چین اور سکون سے زندگی بسر ہوگی کہ زمانہ تم سے موافقت نہیں کر رہا تو تم زمانے کے ساتھ موافقت کرلو۔ لیکن غیرت وحمیت کا تقاضا بالکل برعکس ہے ع

''زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز!''

''زمانہ تم سے موافقت نہیں کرتا تو تم اس سے لڑو!''

پس دینی فرائض کی پہلی منزل پر تین اطراف و جوانب میں یہ تین کشمکشیں ہیں جو ہر اُس شخص کو کرنی ہوں گی جو واقعتہً اللہ کا بندہ بننے کا ارادہ اور عزم رکھتا ہو۔

دوسری منزل: شہادت علی الناس

فرائض دینی کی دوسری منزل ہے اس دین کو عام کرنا' دوسروں تک پہنچانا' اسے پھیلانا۔ اس کے لیے چار اصطلاحات اہم ہیں۔ پہلی دو اصطلاحات ہیں: ''تبلیغ'' اور ''دعوت''۔ یہ بھی اطاعت وتقویٰ کی طرح تصویر کے دو رُخ اور مثبت ومنفی مفہوم کے حامل الفاظ ہیں۔ تبلیغ سے مراد پہنچانا اور دعوت سے مراد لوگوں کو کھینچ کر راہِ حق پر لے آنا ہے۔ یہ بھی ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں۔ تبلیغ کے لیے نبی اکرم ﷺ کو یہ تاکیدی حکم ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾ (المائدة:٦٧)

''اے رسول (ﷺ)! پہنچایئے جو آپ کی طرف آپ کے ربّ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو (گویا) اپنی رسالت کا حق ادا نہ کیا۔''

نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اُمّت کو جو آخری تاکیدی حکم دیا وہ اسی تبلیغ کا تھا۔ فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ''پس جو موجود ہے (مخاطب ہے) اسے چاہیے کہ (یہ پیغام) اس کو پہنچائے جو یہاں موجود نہیں ہے!'' مزید برآں آنحضور ﷺ نے یہ فرما کر ہر مسلمان کے لیے فریضۂ تبلیغ آسان ترین فرما دیا: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً)) ''میری طرف سے پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو''۔ دعوت کے لیے نبی اکرم ﷺ کو تاکیدی حکم ہوا:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ﴾ (النحل:١٢٥)

''(اے نبیؐ!) اپنے ربّ کے راستے کی طرف بلایئے حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان (کفار ومشرکین) کے ساتھ مجادلہ کیجیے احسن طریقے سے۔''

یہ بڑی مہتم بالشان آیت ہے' اس پر میں بعد میں کچھ عرض کروں گا۔ یہاں اتنا سمجھ لیجیے کہ اس آیت میں دعوت کی تین سطحیں (levels) بیان ہوئی ہیں۔

دعوت کے ضمن میں ایک مزید اٹل اور رہنما اصول اس آیت مبارکہ میں بیان کر دیا گیا:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۳۳﴾ (حٰمٓ السجدة)

''اور اُس سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے یقیناً میں خود بھی فرمانبرداروں (مسلمانوں) میں سے ہوں!''

یعنی دعوت اللہ کی طرف ہو' اس کے ساتھ ہی داعی کی سیرت وکردار عملِ صالح کا مظہر ہو۔ مزید برآں وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے' مسلمان کہلائے۔ اس کی دعوت کسی فقہی مسلک کی طرف نہ ہو اور نہ ہی اس کا لیبل چسپاں ہو۔ جو شخص اللہ کی طرف دعوت دے اس سے بہتر بات اور کسی کی نہیں ہوسکتی۔

اسی دوسری منزل کے لیے دو اصطلاحات مزید ہیں جو بڑی اہم ہیں' لیکن ان کا ادراک وشعور قریباً معدوم کے درجے میں آ گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں' الا ماشاء اللہ' چند ہی لوگ ہوں گے جو اِن کی اہمیت کو سمجھتے ہوں گے اور ان پر عمل کرتے ہوں گے۔ ان میں تیسری اصطلاح ہے: ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر''' یعنی نیکیوں کا پرچار' اُن کی تلقین' اُن کا حکم اور برائیوں سے' بدی سے لوگوں کو روکنا' بدی اور برائی کے راستہ

میں آڑے آنا۔ ہماری ایک دینی تحریک میں امر بالمعروف پر ایک درجہ میں عمل بھی ہو رہا ہے تو اس میں نہی عن المنکر سے صرفِ نظر ہے۔ حالانکہ حدیث شریف میں نہی عن المنکر پر زیادہ زور اور تاکید ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ ' وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (۱)

''(اے مسلمانو!) تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ (یعنی طاقت) سے روکے' اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے (یعنی نصیحت و تلقین کرے) اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو (کم از کم) دل میں اسے برا جانے (اس پر کڑھے اور پیچ و تاب کھائے) اور یہ کمزور ترین ایمان (کی نشانی) ہے۔''

ہمارے اس دَور کے لحاظ سے مسلم شریف کی ایک اور حدیث بہت اہم اور قابل التفات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِیْ اُمَّۃٍ قَبْلِیْ اِلاَّ کَانَ لَہٗ فِیْ اُمَّتِہٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِہٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِہٖ ' ثُمَّ اِنَّھَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِھِمْ خُلُوْفٌ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَالَا یُؤْمَرُوْنَ' فَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِیَدِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاھَدَ ھُمْ بِلِسَانِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِقَلْبِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ' وَلَیْسَ وَرَآءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ)) (۲)

''مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا' اس کی امّت میں اس کے ایسے حواری اور ساتھی ہوا کرتے تھے جو اس نبی کی سنت پر عمل کرتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اُن حوارییّن کے بعد ایسے نالائق جانشین آ جاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور ایسے کام کیا کرتے تھے جن کا

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان (۲) حوالہ سابقہ

انہیں (اللہ کی طرف سے) حکم نہیں ہوا کرتا تھا۔ تو ایسے لوگوں سے جو ہاتھ سے جہاد کرے تو وہ مؤمن ہے' اور جو زبان سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے' اور جو دل سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے' اور اس کے ورے تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔''

یہ ہے ہمارے دین میں نہی عن المنکر کی اہمیت۔

اس دوسری منزل کے لیے چوتھی جامع ترین اصطلاح ہے ''شہادت علی الناس''۔ جیسے پہلی منزل کے لیے جامع ترین اصطلاح میں نے ''عبادت'' بیان کی تھی' دوسری منزل کے لیے ''شہادت علی الناس'' جامع ترین اصطلاح ہے۔ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور آخری رسول ہیں۔ لہٰذا آپؐ کی اُمّت بھی آخری اُمت ہے۔ یہ اُمت اس لیے برپا کی گئی ہے کہ تاقیامِ قیامت نوعِ انسانی پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا ط﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''اور اس طرح (اے مسلمانو!) ہم نے تمہیں بہترین امّت بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائیں۔''

سورۃ الحج کی آخری آیت اس موضوع پر بڑی عظیم آیت ہے۔ فرمایا:

﴿وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ط ھُوَ اجْتَبٰکُمْ﴾

''اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ (اور جتنا کہ) اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے (پسند کر لیا ہے' ایک خاص مقصد کے لیے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے)۔''

درمیان میں ایک جملہ معترضہ ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ ط ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا﴾

اس کے بعد اُمت کے اجتباء (چن لیے جانے) کا مقصد بایں الفاظ بیان ہوا:

﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ج﴾

''تا کہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم پوری نوعِ انسانی کے لیے گواہ بن جاؤ''۔

یعنی لوگوں پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دے کر حجت قائم کرو تا کہ قیامت کے دن عدالتِ خداوندی میں گواہی دے سکو' testify کر سکو کہ پروردگار! ہم نے تیرا دین ان تک پہنچا دیا تھا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت میں پہلے اُمت کا ذکر ہوا اور پھر رسولؐ کا' لیکن یہاں پہلے رسولؐ اور پھر اُمت کا ذکر ہے۔

شہادت علی الناس وہ اصطلاح ہے کہ یہاں آ کر اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تعلق کارِ رسالت سے جڑ جاتا ہے۔ چونکہ آنحضور ﷺ آخری نبی اور آخری رسول ہیں لہٰذا یہ آپؐ کی ذمہ داری ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے اور اپنے قول و عمل کی ہم آہنگی کی شہادت کے ذریعے ''دین الحق'' کو بالفعل قائم کر کے اس کی برکات کے ذریعے لوگوں پر حجت قائم کریں۔ اس شہادت کی اہمیت کا اندازہ سورۃ النساء کی اس آیت سے لگائیے' فرمایا:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝﴾ (النساء)

''اس دن کیا حال ہوگا جس دن ہم ہر اُمّت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے' اور (اے نبیؐ!) ان سب پر آپؐ کو گواہ بنا کر لائیں گے!''

عدالتِ خداوندی میں رسولؐ دراصل استغاثہ کے گواہ ہوں گے' وہ کہیں گے اے پروردگار! میں نے تیرا پیغام اپنے قول و عمل سے شہادت دیتے ہوئے بنی نوعِ انسان تک پہنچا کر اُن پر حجت قائم کر دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد شہادت علی الناس کی یہ ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر ہے۔

شہادت علی الناس کی ذمہ داری کی نزاکت کو سمجھ لیجئے۔ اگر بالفرض رسولؐ اللہ تعالیٰ کا پیغام نہ پہنچاتے تو اللہ کے یہاں وہ مسئول ہوتے۔ انہوں نے پہنچا دیا تو وہ بری ہو گئے۔ اب لوگ جواب دہ ہوں گے۔ (۱) نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ کے مجمع

(۱) یہی بات سورۃ الاعراف میں اس اسلوب سے بیان فرمائی گئی: ◄◄

سے گواہی لے لی: اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ اور پورے مجمع نے بیک زبان ہو کر گواہی دی: قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ۔ تین بار یہ سوال و جواب ہوئے۔ اس کے بعد حضورؐ نے آسمان کی طرف' پھر مجمع کی طرف اپنی انگشتِ مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ۔ اُمت کا اجتباء جہاں بہت بڑا اعزاز ہے وہاں بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ اگر اُمت نے اس شہادت علی الناس کا فریضہ انجام نہیں دیا تو بنی نوعِ انسان کی گمراہی کے وبال سے عدالتِ خداوندی میں بچنا محال ہو جائے گا اور نبی اکرم ﷺ کی گواہی ہمارے خلاف ہو جائے گی۔

دعوت و تبلیغ کی تین سطحیں

اس تبلیغ و دعوت کی بھی تین سطحیں ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے' ورنہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس مغالطہ میں مبتلا رہیں کہ ہم تو تبلیغ کا حق ادا کر رہے ہیں' درآں حالیکہ وہ صورتِ تبلیغ ہو' حقیقی تبلیغ نہ ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ الحمد للہ اس دور میں ایک خاص سطح پر تبلیغ و دعوت کے لیے ایک بہت وسیع حرکت ہو چکی ہے۔ اس کے حجم کا جہاں تک تعلق ہے وہ بڑا متاثر کن ہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد اس گلوب پر ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں۔ لیکن میں پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ تبلیغ اور دعوت کے لیے اگر ہم نے قرآنی ہدایات کو اپنا امام نہ بنایا اور ان کے مطابق کام نہ کیا جا سکا تو مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوں گے۔ اس ضمن میں وہی دو آیات دوبارہ ملاحظہ کیجیے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ پہلی آیت ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط﴾ (المائدۃ:٦٧)

اس آیتِ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کو جس تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے وہ قرآن مجید ہے۔

◄◄ ﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾

''پس یہ لازماً ہو کر رہنا ہے' کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور رسولوں سے بھی پوچھیں (کہ انہوں نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا یا نہیں اور ان کو کیا جواب ملا)''۔ (جمیل الرحمٰن)

ارشاد ہوا: ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ﴾ یعنی ''تبلیغ کیجیے اس کی (یعنی قرآن کی) جو آپ پر اتارا گیا ہے آپ کے ربّ کی جانب سے''۔ پس تبلیغ کا اصل محور و مرکز قرآن مجید ہونا چاہیے۔ پھر حضور ﷺ کے ارشادِ مبارک نے ہر مسلمان کے لیے قرآن حکیم کی تبلیغ کے کام کو آسان بنا دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً)) ''پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت پہنچاؤ۔'' یہاں ''عَنِّیْ'' کا لفظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ یہ لفظ یہاں جس معنی و مفہوم کا حامل ہے اسے انگریزی میں ادا کیا جائے تو وہ ہوگا ''on my behalf''۔ قرآن مجید کی تبلیغ کی اصلاً ذمہ داری ہے نبی اکرم ﷺ کی۔ چنانچہ اسی آیتِ مبارکہ کے اگلے حصہ میں فرمایا: ﴿وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾ ''اور اگر آپ (ﷺ) نے بالفرض یہ کام نہیں کیا تو آپؐ نے تبلیغِ رسالت کا حق ادا نہ کیا۔'' میں نے ترجمہ میں لفظ ''بالفرض'' کا اضافہ اس لیے کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق ذرا سا یہ گمان کہ آپ قرآن حکیم کی تبلیغ میں کوتاہی فرمائیں گے، ایمان کے منافی ہو جائے گا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ یہ اسلوبِ بیان درحقیقت امت کے انتباہ (warning) کے لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ کہیں وہ اس ذمہ داری سے غافل نہ ہو جائے جو پوری اُمت پر بحیثیت کُل اور ہر مسلمان پر بحیثیتِ اُمتیٔ رسولؐ عائد ہوتی ہے۔

دوسری آیت جس کی تفصیل میں نے مؤخر کر دی تھی، اس کے حوالے سے دعوت کی تین سطحوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ آیت مبارکہ ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ﴾ (النحل: ۱۲۵)

''(اے نبیؐ) دعوت دو اپنے ربّ کے راستہ کی طرف حکمت و دانائی کے ساتھ، اور عمدہ وعظ و نصیحت کے ساتھ، اور (ہٹ دھرم، ضدی اور حجتی) لوگوں کے ساتھ مجادلہ کرو اس طریق پر جو بہت ہی عمدہ ہو۔''

ہر دور اور ہر معاشرے میں آپ کو لوگوں کی تین سطحیں ملیں گی۔ ایک سب سے بلند سطح کے لوگ ہوتے ہیں، یعنی ذہین اقلیت (intellectual minority)۔ اسی کو intelligentsia بھی کہتے ہیں۔ یہی brain trust کہلاتا ہے۔ یہ طبقہ اگرچہ قلیل ترین اقلیت میں ہوتا ہے لیکن معاشرے میں مؤثر ترین ہوتا ہے اور معاشرے کا رُخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جیسے انسان کے جسم میں دماغ ہے جو وزن کے لحاظ سے کم و بیش آدھ سیر کا ہوگا، لیکن یہ اس کے پورے وجود اور پورے تن و توش کو کنٹرول کرتا ہے۔ ہاتھ پکڑ سکتا ہے، لیکن کس شے کو پکڑے، کس کو نہ پکڑے، اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا، اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ ٹانگیں اسے لے کر چل سکتی ہیں، لیکن کس سمت میں چلیں، کس میں نہ چلیں، اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کا رُخ درحقیقت یہی ذہین اقلیت متعین کرتی ہے۔ اس کو جب تک دعوت دینے کا تقاضا دلیل کے ساتھ، برہان کے ساتھ پورا نہیں کیا جائے گا، یہ طبقہ کوئی اثر قبول نہیں کرے گا۔ جیسے قرآن حکیم یہود کو کھلا چیلنج کرتا ہے:

﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ (البقرۃ)

''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دو کہ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو''۔

اگر اس ذہین اقلیت کو اعلیٰ علمی و فکری سطح پر مدلل طور پر آپ دین کی دعوت پیش نہیں کریں گے اور اسے by pass کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ ذہین اقلیت دین کے حق میں ہموار نہ ہو سکے گی۔ اگرچہ by pass دل کے آپریشن میں بہت مفید ہوتا ہے، لیکن اسلامی انقلابی عمل میں یہ طرزِ عمل بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اگر عوامی سطح پر بات پھیلتی چلی جا رہی ہے لیکن ذہین اقلیت میں وہ بار نہیں پا رہی تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا، اجتماعی سطح پر کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لہٰذا یہاں ہدایت آئی: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ﴾ ''اے نبی! (لوگوں کو) حکمت کے ساتھ اپنے ربّ کے راستے کی طرف دعوت دیجیے''۔ اس حکمت کے ساتھ جس کے متعلق ایک مقام پر فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ﴾ (البقرۃ: ۲۶۹) ''اور جس کو حکمت و دانائی ملی، اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی (بہت خیر مل گیا)۔'' مجھے بڑا افسوس ہے کہ بعض

لوگوں نے یہاں ’’حکمت‘‘ کو حکمتِ عملی کے معنی میں لے کر اس آیتِ مبارکہ کی بڑی حق تلفی کی ہے۔ حکمتِ عملی بالکل دوسری چیز ہے‘ اگرچہ وہ بھی یقیناً مطلوب شے ہے‘ لیکن یہاں جس شان کے ساتھ یہ لفظ آیا ہے‘ درحقیقت اس کا مفہوم حکمت عملی نہیں ہے‘ بلکہ دلائل و براہین کے ساتھ‘ دانائی کے ساتھ‘ اس دعوت کو پیش کرنا ہے۔ اگر سوسائٹی کی ذہین اقلیت کو اِس وقت اور اس دَور کی اعلیٰ علمی وفکری سطح پر دعوت پیش نہ کی جا سکے تو معاشرہ بحیثیتِ مجموعی کبھی متاثر نہیں ہوسکتا۔

دعوت کی دوسری سطح ’’عوامی‘‘ ہے۔ عوام کو دعوت عمدہ وعظ اور دل نشین نصیحت کے ذریعے دی جائے گی‘ کیونکہ انہیں کسی دلیل اور حجت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے لیے ضرورت ہے موعظہ حسنہ کی‘ وہی ان کے لیے کفایت کرے گی۔

اس سطح پر یہ بات نہایت اہم ہے کہ سننے والے یہ محسوس کریں کہ جو وعظ کر رہا ہے وہ ہم پر اپنی دین داری‘ علمیت اور شخصیت کی دھونس نہیں جمانا چاہتا‘ بلکہ وہ مخلص ہے اور ہماری خیرخواہی کے لیے بات کہہ رہا ہے۔ اسے کسی دُنیوی اجر اور صلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ساتھ ہی انہیں یہ اعتماد ہو کہ وہ بہروپیا نہیں ہے‘ ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ والا معاملہ نہیں ہے‘ بلکہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اپنی ذاتی اور نجی زندگی میں اس پر خود بھی عمل پیرا ہے۔ یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں‘ ایک موعظہ حسنہ اور دوسرے واعظ کا اعلیٰ کردار تو معاملہ ہوگا: از دل خیزد بر دل ریزد‘ اور ع

’’دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!‘‘

یہ ہے عوامی سطح پر دعوت و تبلیغ۔ میں جانتا ہوں کہ اس دور میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے ایک بڑے طبقے میں عام طور پر وعظ کو ایک گالی کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ بڑے ہی استحقار کے انداز میں کہا جاتا ہے ’’اجی وعظ کہہ رہے ہیں‘‘۔ حالانکہ وعظ بڑی عظیم اور مؤثر شے ہے اور قرآنی اصطلاح ہے‘ لیکن اس کا ایک مقام اور محل ہے جہاں یہ تاثیر دکھاتا ہے۔ یہ عمل غیر موقع اور بے محل ہو گا تو غیر مؤثر رہے گا۔ ظلم کا مطلب ہی یہ ہے: وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّهٖ۔ یعنی ’’کسی چیز کو اپنے اصل مقام کی بجائے کسی اور جگہ رکھنا‘‘۔ ان عوام کو آپ فلسفہ پڑھائیں گے تو حماقت ہوگی اور intellectuals کو آپ وعظ پلائیں گے تو یہ کام بھی غیر معقول ہوگا۔ ہر شے کو اپنی جگہ پر رکھنا ہی عدل ہے۔

تیسری سطح جو ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہے‘ وہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ہٹ دھرم ہوتے ہیں‘ جو کبھی مان کر نہیں دیتے‘ جن کے اپنے مفادات ہوتے ہیں‘ جن کی امداد باہمی کی انجمنیں بنی ہوتی ہیں‘ جن کے مفادات باطل نظام سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے مفادات کی وجہ سے کور چشم ہو چکے ہوتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات علیٰ وجہ البصیرت لوگوں کو گمراہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے زہر کا تریاق فراہم نہ کیا جائے تو یہ عوام الناس کو گمراہ کرتے چلے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں مناظرہ کا فن وجود میں آیا‘ پھر اس نے باقاعدہ ایک خاص تکنیک اور تخصّص (Specialization) کی شکل اختیار کی۔ موجودہ دور میں کچھ لوگوں نے اسے پیشہ ہی بنا لیا تو اس میں چند خرابیاں در آئیں۔ مثلاً مجمع عام ہے‘ داد مل رہی ہے‘ تحسین ہو رہی ہے‘ تالیاں بج رہی ہیں‘ نعرے لگ رہے ہیں۔ گویا اتنی بڑی جیوری (Jury) ہے جس کے سامنے دو پہلوان عقلی کشتی لڑ رہے ہیں۔ یہ مناظرہ اور مجادلہ کا احسن انداز نہیں۔ قرآن مجید جسے مجادلہ کہتا ہے وہ احسن طریق پر محکم دلائل اور براہین کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔

دعوت کی یہ تیسری سطح لازمی ہے۔ اگر یہ کام آپ نہیں کریں گے تو اغیار سے شکست کھا جائیں گے۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے معاشرے میں عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ہم کنویں کے مینڈک کی طرح ایک ہی دائرے میں چکر لگاتے رہے اور فقہی تعبیرات‘ راجح و مرجوح‘ افضل و مفضول کے ردّ و قبول میں آپس میں ہی مناظرے اور دنگل جماتے رہے اور جما رہے ہیں‘ جبکہ اندر ہی اندر عیسائیت دیمک کی طرح ہمارے معاشرے کو کھاتی چلی جا رہی ہے۔ اسی طرح دعوتی سطح پر اس دور میں قادیانیت بہت فعّال ہو گئی ہے[1]۔ قادیانی مبلغین کا انداز بڑا جارحانہ ہوتا ہے اور ایک عام آدمی تو کجا

---

(۱) یہ تقریر قادیانیوں کے بارے میں صدارتی آرڈیننس سے قبل کی ہے۔ (مرتب)

اچھا بھلا پڑھا لکھا، بلکہ عالمِ دین بھی ان کے مناظرین و مبلغین کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ الّا ماشاء اللہ۔ ان قادیانی مناظرین و مبلغین کو جس طرح خاص موضوعات پر تربیت دی گئی ہے، اس کے ردّ اور ابطال کے لیے جب تک ہمارے ذہین و فطین لوگوں کو اسی طرح ٹریننگ نہ ملے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ ایک وقت میں جب یہاں انگریزی حکومت کی سرپرستی میں بڑے زور و شور کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی تھی اور پادری فینڈر نے برصغیر میں تہلکہ مچا دیا تھا، اگر اُس وقت وہ مردِ حق کھڑا نہ ہو گیا ہوتا جس کا نامِ نامی مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہے، رحمتہ اللہ علیہ، تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں مسلمان کس طرح عیسائیت کے اس سیلاب کی نذر ہو جاتے۔ اس پادری فینڈر نے پورے ہندوستان کے علماء کو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر للکارا اور کھلے طور پر دعوتِ مبارزت دی۔ مولانا کیرانوی ؒ خم ٹھونک کر میدان میں آئے اور پادری فینڈر کو میدان چھوڑ کر ہندوستان سے بھاگنا پڑا۔ پھر وہ ترکی پہنچا اور وہاں بھی اس نے یہی ہتھکنڈے شروع کیے۔ عثمانی سلطنت نے مولانا کیرانوی ؒ کو ترکی آنے کی دعوت دی۔ مولانا جب وہاں پہنچے تو پادری فینڈر وہاں سے بھی فرار ہو گیا۔ تو دعوت کی یہ بھی ایک سطح ہے۔ یہ تیسری سطح ہے۔ کچھ لوگ اس کا تحقیر کے انداز میں ذکر کرتے ہیں، حالانکہ یہ بھی کرنے کا کام ہے۔ البتہ واضح رہے کہ قرآن اس کے لیے ہمیں ایک امتیازی اخلاقی معیار قائم رکھنے کا حکم دے رہا ہے: ﴿جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ ۔ یعنی اس مجادلے میں بھی بالکل مخالفین کی سطح پر نہ اتر آؤ، بلکہ تمہارا داعیانہ کردار اور اس کی ایک اخلاقی شان ضرور برقرار رہنی چاہیے۔

ظاہر بات ہے کہ ایک شخص ان تینوں سطحوں پر کام نہیں کر سکتا۔ ہر کام کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ جو سب سے اونچا کام ہے اس کے لیے اس دور میں ''علم کو مسلمان بنانے'' کی ضرورت ہے۔ آج علم ملحد ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں بڑی پیاری بات علامہ اقبال نے کہی ہے ؎

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

معرفتِ خداوندی کی تلوار اس علم کی نیام میں سے نکل گئی ہے۔ یہ نرا خول ہے، اور محض خالی نہیں ہے، بلکہ اس میں الحاد کا خنجر اس تلوار کی جگہ پیوست کر دیا گیا ہے۔ اس علم کو مسلمان بنانا آسان نہیں ہے۔ لوگ نظامِ تعلیم کی بات کیا کرتے ہیں۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ نظام اتنی بڑی بات نہیں ہے، یہ تو تعلیم دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی علم کہاں ہے جسے پہنچایا جائے؟ محض دینیات کا ایک پیریڈ یا اسلامیات کا ایک شعبہ قائم کرنے سے کام نہیں چلے گا، جبکہ طبیعیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات اور جو دوسرے علوم ایک طالب علم حاصل کر رہا ہے، ان کے رگ و پے میں الحاد اور مادہ پرستی سرایت کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ!

توحید کی بنیاد پر جب تک پورے علم کی تدوینِ نو نہیں ہوگی، تمام علوم کو جب تک مسلمان نہیں بنایا جائے گا، ہماری نئی نسل کے اذہان کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔ جب تک سینکڑوں اور ہزاروں اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ)) کو اپنا اصولِ عمل (Motto) بنا کر میدان میں نہیں آئیں گے اور ان کو اداروں اور حکومت کی جانب سے مناسب ذرائع مہیا نہیں کیے جائیں گے اُس وقت تک یہ کام کیسے ہوگا! ہاں وعظ کی سطح پر ہمیں زیادہ جوہر قابل (Talent) مل سکتا ہے۔ رہا مجادلہ کی سطح پر افراد کی ضرورت تو اس کے لیے خصوصی تربیت گاہوں کی ضرورت ہے۔

دعوت کی تینوں سطحوں پر کام کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ باصلاحیت نوجوان جن کے دل میں واقعی دین کا کام کرنے کی تڑپ ہے، ولولہ ہے، اُمنگ اور جذبہ ہے، وہ آگے بڑھیں، ان اعلیٰ و ارفع مقاصد کے لیے اپنا دُنیوی کیریئر قربان کریں اور اپنی جانیں ان مقاصد کے حصول میں کھپائیں، تب جا کر ہی یہ کام ہو

گا۔اور یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل۔دین کی تبلیغ اور دعوت کے لیے مال و جان کو ان تینوں سطحوں پر کھپانا۔

عجب حسنِ اتفاق ہے کہ میں نے نہی عن المنکر سے متعلق جو دو حدیثیں بیان کی ہیں ان میں نہی عن المنکر کے کام کی انجام دہی کے لیے تین سطحوں ہی کا بیان ہوا ہے۔ پہلی سطح یہ ہے کہ بدی اور برائی کو ہاتھ یعنی قوت و طاقت سے روک دینا۔دوسری یہ کہ اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے' وعظ سے اور تلقین و نصیحت سے اس کو روکنا' اس کی مذمت کرنا۔اور تیسری سطح یہ ہے کہ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں اسے برا جاننا' اس پر گھٹن محسوس کرنا' اس پر پیچ و تاب کھانا۔اور یہ آخری سطح ایمان کے کمزور ترین ہونے کی دلیل ہے۔ دوسری حدیث میں ان تینوں سطحوں کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ''جہاد'' کا لفظ استعمال فرمایا۔

اس دوسری منزل کے لیے ایک دوسرا عنوان ''نظریاتی کشمکش'' یا ''فکری تصادم'' ہے۔اگر آپ توحید کو پھیلانا چاہتے ہیں تو مشرکانہ اوہام رکھنے والے موجود ہیں' ان سے نظریاتی سطح پر تصادم اور مقابلہ ہوگا۔آپ کو walk over نہیں مل جائے گا۔کس قدر اہم بات ہے کہ قرآن مجید نے یہی لفظ ''جہاد'' مشرک والدین کے ضمن میں دو جگہ استعمال کیا ہے' ایک سورۃ لقمان میں اور دوسرے سورۃ العنکبوت میں۔جو نوجوان نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے تھے تو ان کے مشرک والدین ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ وہ واپس اپنے آبائی دین پر آ جائیں۔سورۃ لقمان میں ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

معلوم ہوا کہ مشرک بھی مجاہد تھے۔وہ مجاہد فی سبیل الشرک اور مجاہد فی سبیل الطاغوت تھے اور نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب رضی اللہ عنہم بھی مجاہد تھے اور وہ تھے مجاہد فی سبیل اللہ اور مجاہد فی التوحید۔یہ جہاد اور یہ کشمکش آپ کو ہر دور میں ملے گی اور یہ بات بغیر استثناء کے حقیقتِ نفس الامری ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

تیسری منزل۔غلبہ و اقامتِ دین

جہاد کی تیسری منزل سب سے کٹھن' سب سے بھاری اور سب سے مشکل ہے۔ اور یہ ہے دین کو غالب کرنے' قائم کرنے اور نافذ کرنے کے لیے' اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے' اس مقصد کے لیے کہ دین کا تجزیہ اور اس کے حصے بخرے کیے بغیر وہ کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے' جہاد کرنا۔جیسے انفرادی سطح پر فرمایا گیا:﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ﴾ ویسے ہی اجتماعی سطح پر دین کے غلبہ کے لیے جہاد و قتال کا حکم دیا گیا۔فرمایا:﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾۔ یہ ہے جہاد کی بلند ترین چوٹی اور سب سے کٹھن اور مشکل مرحلہ۔اس کی وجہ بھی اظہر من الشّمس ہے۔پہلی منزل پر ذاتی سطح پر نفس کے ساتھ کشمکش تھی۔دوسری منزل پر اہل زیغ کے ساتھ نظریاتی اور فکری سطح پر کشمکش تھی۔اس تیسری منزل پر طاغوتی نظام کو ہٹانے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے' اس لیے کہ دو نظام کسی حال میں بھی co-exist نہیں کر سکتے۔ پچاس مذاہب بھی ایک بالاتر نظام کے تحت اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ مذاہب باہمی اختلافات کے علی الرغم پُرامن طور پر پہلو بہ پہلو زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ بالکل قابلِ عمل ہے—اس لیے کہ دنیا کا غالب تصور یہی ہے کہ مذہب تو لوگوں کے انفرادی اور نجی مسائل و معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔اجتماعیات کے تمام امور میں مذہب کا عمل دخل اِس دور میں تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ یہ سیکولر فیلڈ ہے۔ جیسا کہ انگریز کے دور میں ہندوستان میں اصل نظامِ اجتماعی (Law of the Land) سرکارِ انگلشیہ کا تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے تمام مذاہب کے لوگوں کو آزادی تھی کہ وہ اپنے شخصی معاملات میں اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں۔انگریزی حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔جیسے دستوری اور نظری طور پر موجودہ بھارت میں بھی یہ بات تسلیم شدہ ہے اور تمام مذاہب کے حقوق دستور میں معین ہیں۔

بہرحال ایک ملک میں دین یعنی نظامِ اجتماعی ایک ہی رہ سکتا ہے۔دو نظام نہ رہ

سکتے ہیں نہ چل سکتے ہیں۔ جس طرح ایک نیام میں بیک وقت دو تلواریں نہیں سما سکتیں‘ اسی طرح ایک ملک میں دو نظام نہیں چل سکتے۔ ایک گدڑی میں بہت سے درویش سما سکتے ہیں‘ لیکن ایک شال میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے۔ معلوم ہوا کہ ہر نظام اپنا غلبہ چاہتا ہے اور اگر اسلام محض مذہب نہیں‘ بلکہ دین ہے‘ جیسا کہ فی الواقع وہ ہے: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ تو اس کو غلبہ درکار ہے۔ یہ منزل انگریزوں کی دو سو سالہ غلامی کی وجہ سے ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو گئی تھی اور اب بھی بڑی مشکل سے یہ تصور لوگوں کے ذہنوں کے سامنے آ رہا ہے۔ چونکہ غلامی کے تقریباً دو سو سال کے درمیان اسلام دین نہیں رہا تھا‘ صرف مذہب بن گیا تھا‘ لہٰذا ہمارا سارا تصور اکثر و بیشتر تو پہلی منزل تک محدود ہے‘ یعنی عبادات اور حلال وحرام کے موٹے موٹے احکام ہم جانتے ہیں۔ دوسری منزل کی طرف بھی پیش رفت ہوئی‘ یعنی تبلیغ‘ دین کو پہنچانا‘ اسے عام کرنے کی کوشش کرنا۔ لیکن یہ بات ذہنوں سے اوجھل ہوگئی کہ ہمارا دین اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی عَلَیْہِ۔ اسلام دین ہے اور دین ہوتا ہی وہ ہے جو غالب ہو۔ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

میں بڑے جزم کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام جب غالب ہوتا ہے تو دین ہوتا ہے اور جب مغلوب ہوتا ہے تو صرف مذہب رہ جاتا ہے۔ ہماری دو سو سالہ سیاسی اور فکری غلامی نے اس مذہبی تصور کو اس طریقے سے ہمارے ذہنوں میں نقش اور راسخ کر دیا ہے کہ اگر بڑی محنت کے بعد کسی کے سامنے یہ تصور واضح ہوتا ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے تو تھوڑے عرصہ کے بعد مضمحل ہو کر ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور پھر توجہ اس کے مذہبی تصور تک محدود ہو جاتی ہے۔ ہمارا اسلام کا محض مذہبی تصور انگریزی دَور میں اتنا راسخ ہو چکا تھا کہ ہمارے بعض زعماء نے انگریز حکومت کی بھی بڑی مدح کی تھی کہ اس نے ہمیں بڑی مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ لہٰذا حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلانا یا اس میں حصہ لینا مسلمانوں کے لیے قطعی نامناسب ہے۔ اسی پر مردِ قلندر اقبال نے یہ پھبتی چست کی تھی ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اسلام کا غلبہ اور اسلام کا ایک دین کی حیثیت سے بالفعل قائم و نافذ کرنا‘ یہ ہے ہمارے فرائضِ دینی کی تیسری اور بلند ترین منزل۔

اقامت دین کا مرحلہ اور تصادم

اب آیئے ایک قاعدہ کلیہ اور اٹل اصول کی طرف! وہ یہ کہ آپ اپنا نظام لانا چاہتے ہیں تو فی الوقت نافذ و قائم نظام کو ہٹانا ہوگا۔ جیسا کہ مولانا رومؒ نے کہا ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

انقلاب کے لیے یہ عمل لازم و لابدی اور ناگزیر ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو نظام بھی کہیں قائم ہوتا ہے‘ اس کے ساتھ کچھ لوگوں کے مفادات‘ چودھراہٹیں‘ سیادتیں اور قیادتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ مراعات یافتہ طبقات جن کو اپنے حق سے زیادہ مل رہا ہے‘ جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں‘ جن کے پاس اختیارات اور حقوق کا ناجائز ارتکاز ہو گیا ہے‘ وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی اس نظام کو چھیڑے‘ اسے ہاتھ لگائے۔ وہ تو اس کے تحفظ کے لیے فوراً اٹھ کھڑے ہوں گے کہ ع

’’نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے‘‘

ہوش میں آؤ‘ اپنی قوتوں کو مجتمع کرو‘ یہ ایک آندھی آ رہی ہے جو تمہارے مفادات اور تمہاری مراعات کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائے گی۔ یہ کشمکش بڑی شدید ہے۔ قرآن مجید میں تین مقامات پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

(التوبۃ:۳۳‘الفتح:۲۸‘الصف:۹)

اوران میں سے دومقامات پرآیت کا خاتمہ ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کے الفاظ پر ہوا ہے۔یعنی یہ ایک اٹل قانون ہے کہ مشرک کبھی دینِ حق کا غلبہ برداشت نہیں کرسکیں گے۔تصادم ہو کر رہے گا۔ اب نظریاتی تصادم اگلے مرحلہ میں داخل ہو گا اور بالفعل (Physical) تصادم ہوگا۔اب طاقت' طاقت سے ٹکرائے گی۔

اس بالفعل تصادم (Physical Collision) کے بھی تین مرحلے ہیں۔اس کے پہلے مرحلہ کو ہم کہیں گے''صبرمحض'' کہ ماریں کھاؤ مگراپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بارہ برس مکّہ میں یہی حکم رہا کہ اگرتمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پرننگی پیٹھ لٹایا جا رہاہےتولیٹ جاؤ' مگر جوابی کارروائی نہیں کر سکتے۔اس کوجدید اصطلاح میں کہیں گے: Passive Resistance—یعنی کلمۂ توحید اورکلمۂ طیبہ پر قائم رہو' لیکن ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔

اس تصادم کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر طاقت اتنی فراہم ہوگئی ہے کہ اقدام کیا جا سکتا ہےتو آگے بڑھواور باطل کوللکارواورچیلنج کرو۔اس نظام کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑو۔اسے جدید اصطلاح میں کہا جائے گا Active Resistance یعنی اقدام۔

اس کا تیسرا اورآخری مرحلہ ہے Armed Conflict یامسلح تصادم یعنی اب ہاتھ بھی کھول دیے گئے ہیں اوراذنِ قتال دے دیا گیا ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۝﴾

(الحج)

''(آج سے) ان لوگوں کواجازت دے دی گئی جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں' اوراللہ یقیناً ان کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے۔''

مکی دورصبرِ محض کا دور تھا۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد نبی اکرمﷺ نے اقدام فرمایا اور چھاپے مار دستے بھیج کر قریش کی تجارت کے دونوں راستوں کو' جو مکہ سے یمن اور مکہ سے شام کی طرف جاتے تھے' مخدوش بنا دیا۔ گویا قریش کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا' کیونکہ ان کی معاش کا بہت بڑا انحصار ان ہی راستوں کے ذریعہ تجارت پر تھا۔

صبرمحض کے بعد ہر انقلابی عمل میں ''مسلح تصادم'' کا لازمی اور آخری مرحلہ آتا ہے۔ یہ انقلابی دعوت وقت کے جن فراعنہ کے مفادات کو چیلنج کرتی ہے' وہ جب اس دعوت کو توسیع پذیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس کو کچلنے کے لیے اپنی عسکری طاقت کو میدان میں لاتے ہیں اور اس طرح مسلح تصادم کا تیسرا اور آخری مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہر انقلابی دعوت کو لازماً اس آخری مرحلہ سے سابقہ پیش آ کر رہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ انقلابی دعوت وقت کے رائج و نافذ نظام کے ساتھ retaliate کرتی ہے۔ اب تک تو وہ جھیل رہی تھی' برداشت کررہی تھی' لیکن جب وہ اقدام کا مرحلہ شروع کرتی ہے تو نظامِ باطل اس کو کچلنے کے لیے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بڑھتا ہے اور آخری مرحلے پر مسلح تصادم کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسلامی انقلاب کی صورت میں یہی مسلح تصادم جہاد کی آخری چوٹی ''قتال فی سبیل اللہ'' بن جاتا ہے۔ چنانچہ نبی کریمﷺ کی انقلابی جدوجہد میں ایک وقت وہ تھا کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی' لیکن آخری مرحلے پر وہ وقت بھی آیا کہ جس کے متعلق حکمِ الٰہی آتا ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ)

''(مسلمانو!) تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے' اور وہ تمہیں ناپسند ہے' اور ہوسکتا ہے کہ تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو درانحالیکہ اسی میں تمہارے لیے خیر ہو' اور ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں پسند ہو درانحالیکہ اس میں تمہارے لیے شر ہو۔اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

اس قتال کا ہدف (target) یہ ہے کہ مسلمانو! اب جبکہ تمہاری تلوار نیام سے باہر آ گئی ہے' تو یہ اُس وقت تک نیام میں نہیں جائے گی جب تک فتنہ وفساد بالکل فرو نہ ہو جائے اور اللہ کے خلاف بغاوت بالکل کچل نہ دی جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے نہ ہو جائے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ

كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (الانفال:۳۹) یہاں فتنہ سے مراد کیا ہے؟ اس کی ہمارے اکثر اصحابِ علم مختلف تشریحات و توجیہات کرتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ چونکہ ہمارا دین کا تصور غیر انقلابی بن گیا ہے لہٰذا جہاں کہیں بھی انقلابی بات آتی ہے تو پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فتنوں کا شمار مشکل ہے' استحصال بھی فتنہ ہے' ناانصافی بھی فتنہ ہے' لیکن وہ اصل فتنہ کیا ہے جو اِس آیت میں مراد ہے اور جو اُمّ الفتن ہے؟ وہ یہ ہے کہ یہ زمین اللہ کی ہے' اس کا جائز حاکم صرف اُس کی ذات ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اگر زمین پر تشریعی معاملات اور اجتماعی نظامِ حیات میں اللہ کے سوا کسی اور کا حکم چل رہا ہے تو یہ اس کے خلاف صریح بغاوت ہے۔ یہی سب سے بڑا فتنہ ہے۔

یہاں فتنہ سے اصلاً یہی فتنہ مراد ہے۔ اسی کے متعلق ایک مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۹۱) اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ﴾ (البقرۃ:۲۱۷) غور کیجیے وہاں قتال و مقاتلہ کن کے خلاف تھا! اپنی ہی قوم اور اپنے قبیلہ کے لوگ' اپنے ہی بھائی بند' اپنے ہی اعزّہ و اقارب مدمقابل تھے' لیکن وہ طاغوتی نظام کے علمبردار تھے اور اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس بات پر مامور کی گئی تھی کہ اجتماعی نظام خالصتاً توحید کے انقلابی نظریے پر قائم ہو۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۗ﴾ (الزمر:۳) اور: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۗ﴾ (الشوریٰ:۱۳) سورۃ التوبۃ اور سورۃ الصّف میں جہاں خاتم النبیین والمرسلین ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان یہ بیان ہوئی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تو دونوں مقامات کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ ''اور چاہے مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو!''

جن لوگوں کے مفادات اور جن کی قیادت و سیادت نظامِ باطل سے وابستہ ہو وہ اس بات کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کا طاغوتی نظام بیخ و بن سے اکھاڑ کر توحید پر مبنی نظامِ عدل و قسط قائم کیا جائے۔ وہ تو مزاحمت کریں گے' مخالفت کریں گے اور اپنی پوری طاقت دین اللہ کے قیام و نفاذ کو روکنے کے لیے صرف کر دیں گے۔ لہٰذا اللہ کے فرماں برداروں کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ کے باغیوں سے پنجہ آزمائی کریں' ان سے نبرد آزما ہوں اور اللہ تعالیٰ کی تشریعی حکومت کو قائم کرنے کے لیے اپنا تن' من' دھن سب کچھ قربان کر دیں' تاکہ ''حق بحق دار رسید'' والا معاملہ ہو جائے۔ جو لوگ یہ قربانی دیں تو وہ سرخرو ہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾﴾ (الاحزاب)

''اہل ایمان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے (اس کی راہ میں گردنیں کٹا کر سرخرو ہو چکے ہیں) پس ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے' اور ان اہل ایمان نے اپنے اس رویے اور طرزِ عمل میں ذرّہ برابر تبدیلی نہیں کی۔''

لیکن اگر ایمان کے دعوے دار بیٹھے رہیں' باطل کے ساتھ کوئی کشمکش نہ کریں' بلکہ اس کے زیرِ عافیت چین کی بانسری بجائیں' اپنے معیارِ زندگی کی بلندی ہی مقصود و مطلوب بن جائے تو یہ طرزِ عمل دُنیوی قانون میں بھی اعانتِ جرم ہے۔ یہ باغیوں کے ساتھ ایک نوع کا تعاون قرار دیا جاتا ہے۔ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ کا سب سے بڑا سبب یہی بغاوت ہوتی ہے۔ کائنات کے تکوینی نظام پر جس اللہ کی حکومت قائم ہے' یہ زمین اسی اللہ کی ہے' لہٰذا اس پر اس کی تشریعی حکومت بھی قائم ہونی چاہیے۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۗ﴾ حکم دینے کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے۔ لیکن اس اصل الاصول کو چھوڑ کر خواہ کوئی فردِ واحد ہو' کوئی قوم ہو' عوام ہوں' کسے باشد' کوئی بھی ہو' وہ اگر اپنا حکم چلوا رہا ہے تو درحقیقت وہ خدائی کا مدعی ہے اور اللہ کا باغی ہے۔ مسلمان تو وہ ہے جو صرف اللہ کا وفادار ہو۔ اس موقع پر اچانک میرا ذہن اس مقدمۂ بغاوت کی طرف منتقل ہوا جو ہمارے ہی شہر کراچی کے خالق دینا ہال میں ہمارے چند اکابر کے خلاف

پہلی جنگ عظیم کے دوران قائم ہوا تھا۔ یہ مقدمہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ ہماری تاریخ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کے ذکر سے ہمیں کسی درجے میں سہارا ملتا ہے کہ انہوں نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک مسلمان کے شایانِ شان ہے۔ ان اکابر نے پہلی جنگ عظیم کے اس ٹریبونل کے سامنے جو انگریزی حکومت نے بغاوت کے مقدمہ کے لیے قائم کیا تھا' برملا کہا تھا کہ ہاں ہم انگریزی حکومت کے باغی ہیں' اس لیے کہ مسلمان صرف اللہ کا وفادار ہوسکتا ہے' وہ کبھی غیر اللہ کا وفادار نہیں ہوسکتا!

ایمان اور جہاد لازم وملزوم ہیں

بہرحال یہ ہیں جہاد کے تین درجے۔ ان کو مزید پھیلائیں گے تو نو (۹) درجے بن جائیں گے اور نویں منزل پر جا کر یہ جہاد قتال بنتا ہے جو اس کی چوٹی اور اس کا نقطۂ عروج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصّف میں جہاں جہاد کی بات ہوئی یہ بات صراحت سے سامنے آتی ہے کہ جہاد تو ایمان کی بنیاد (base) ہے۔ جہاد نہیں کرو گے تو عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانے کی امید محض امیدِ موہوم ہے۔ ﴿تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ﴾ ''یہ محض تمہاری خوش فہمیاں ہیں''۔ اس کی کوئی برہان اور دلیل تمہارے پاس نہیں ہے۔ عذابِ الیم سے رستگاری کے لیے ایمان اور جہاد لازم وملزوم ہیں۔ چنانچہ اسی سورۂ مبارکہ میں فرمایا گیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱﴾

''اے اہلِ ایمان! میں بتاؤں تمہیں وہ تجارت جو تم کو عذابِ الیم سے نجات دلا دے؟ (وہ یہ ہے کہ) ایمان (پختہ) رکھو اللہ اور اُس کے رسول پر اور جہاد کرو اُس کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے' یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''

معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ جہاد ناگزیر ہے۔ اس سے تو مفر ہے ہی نہیں۔ یہ تو نجات کی شرطِ لازم ہے۔ قرآن مجید تو یہ بتاتا ہے کہ جہاد نہیں تو ایمان نہیں۔ دلیل کے لیے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ دیکھئے! فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾

''مؤمن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر اس شان سے ایمان لائے کہ ان کے قلوب تشکیک اور خلجان میں نہیں پڑے (بلکہ ان کو یقینِ قلبی حاصل ہو گیا) اور جنہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں۔ بس صرف یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

اس آیتِ مبارکہ میں حصر کے دو اسلوب آئے ہیں' ایک اِنَّمَا اور دوسرے اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ اسی لیے میں نے ترجمانی میں اس اسلوب کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

آگے چلیے۔ اگر کوئی دُنیوی محبت اللہ کی راہ میں جہاد سے روکنے کے لیے پاؤں میں بیڑی بن کر پڑ گئی تو قرآن مجید کا فتویٰ کیا ہے! اس کے لیے سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ ملاحظہ کیجیے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۴﴾

اللہ کی محبت' اس کے رسول (ﷺ) کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کی عظمت واہمیت پر قرآن حکیم کی یہ بڑی جامع اور مہتم بالشان آیت ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کے سامنے ایک معیار اور کسوٹی رکھ دی گئی ہے۔ ان سے فرمایا گیا ہے کہ اپنے باطن میں ایک ترازو نصب کرلو اور پھر جائزہ لے لو کہ تمہاری اصلی دلی محبتوں کا کیا حال ہے۔ فرمایا کہ اے نبی ﷺ! ان مسلمانوں سے کہہ دیجیے کہ اپنے دل میں نصب شدہ میزان کے ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں ڈالو۔ یعنی اپنے باپوں کی محبت' اپنے بیٹوں کی محبت' اپنے بھائیوں کی محبت' اپنی بیویوں کی محبت اور اپنے رشتہ داروں اور اعزّہ و

اقارب کی محبت۔ ماں، بیٹی، بہن اور شوہر کی محبتوں کا بھی ان میں احاطہ ہو گیا۔ یہ پانچ محبتیں علائقِ دُنیوی سے متعلق ہیں۔ پھر ان کے ساتھ چھٹی محبت اس مال کی جو بڑے چاؤ کے ساتھ تم نے جمع کیا ہے، ساتویں اس کاروبار کی محبت جو تم نے بڑی محنت سے جمایا ہے، جس میں تم نے خون پسینہ ایک کیا ہے، جس کے متعلق تم کو اندیشے لاحق رہتے ہیں کہ کہیں کساد بازاری نہ آ جائے، کہیں گھاٹا نہ ہو جائے، اور آٹھویں ان مکانوں کی محبت جو تم نے بڑے ارمانوں سے تعمیر کیے ہیں، جن کی زیبائش و آرائش پر تم نے پانی کی طرح پیسہ لگایا ہے۔ یہ تین محبتیں اسباب و سامانِ دُنیوی سے متعلق ہیں۔ اب تقابل کے لیے دوسرے پلڑے میں تین محبتیں ڈالو۔ ایک اللہ کی محبت، دوسری اس کے رسول (ﷺ) کی محبت اور تیسری اس کی راہ میں جہاد کی محبت۔ اب دیکھو کون سا پلڑا بھاری پڑا، کون سا جھکا! اگر ان آخر الذکر محبتوں کا پلڑا ہلکا رہ گیا اور علائق و سامانِ دُنیوی کی محبتوں والا پلڑا بھاری پڑ گیا تو جاؤ گومگو کی حالت میں مبتلا رہو اور انتظار کرو! میں محاورے کے طور پر ﴿فَتَرَبَّصُوْا﴾ کا صحیح مفہوم ادا کرنے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ ''جاؤ دفع ہو جاؤ''۔ ﴿حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ ''حتیٰ کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے، اور اللہ ایسے فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

یہاں فاسق کا لفظ انتہائی قابل توجہ ہے۔ جس مسلمان کا دل جہاد کی محبت سے خالی اور اس کی اہمیت و عظمت سے غافل ہے اس کا شمار بھی فاسقوں میں ہوتا ہے۔ میرا ظن غالب ہے کہ اسی آیت مبارکہ سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ شعر کہا تھا:

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الّا اللہ

معلوم ہوا کہ جہاد سے تو مفر ہے ہی نہیں۔ سورۃ الحجرات کی متذکرہ بالا آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے، بلکہ میرے غور و فکر کی حد تک نصِ قطعی ہے کہ ایمانِ حقیقی کے دو رکن ہیں: ایک ہر نوع کے ریب و تشکیک اور ذہنی خلجان سے مبرا یقین قلبی اور دوسرا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد۔

بلا شبہ کلمۂ شہادت، اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، حج اور صوم رمضان، پانچ ارکانِ اسلام ہیں۔ ان میں شہادتین کو بنیاد اور دوسرے چار کو ستون کا مقام حاصل ہے۔ بنیاد اور ستون کے بغیر کسی عمارت کی تعمیر کا تصور ممکن ہی نہیں، لہٰذا میں فرائض دینی کے جامع تصور کو ظاہر کرنے کے لیے جو تین منزلہ عمارت کی مثال پیش کیا کرتا ہوں اس کی ہر منزل کے لیے یہ ارکانِ اسلام ناگزیر ہیں۔ لیکن ایمانِ حقیقی کے دو رکن ہیں۔ ایک قلبی یقین اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ۔ جہاں تک میں نے غور و فکر کیا ہے، نجات کا کوئی دوسرا راستہ اس جہاد کے بغیر مجھے نظر نہیں آتا۔ سورۃ العصر میں نجاتِ اُخروی کے جو ناگزیر لوازم بیان فرمائے گئے ہیں ان میں تیسرا لازمہ اور تیسری ناگزیر شرط ''تواصی بالحق'' قرار دی گئی ہے۔ سورۂ ہود کی پہلی آیت مبارکہ میں یہ اصول بیان فرمایا گیا ہے:

﴿الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴾

''ا ل ر۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں، پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں ایک حکیم باخبر کی طرف سے۔''

چنانچہ قرآن حکیم اسی تواصی بالحق کی شرح کے لیے مزید کئی اصطلاحات بیان کرتا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح بھی اس کی توضیح و تشریح اور تفصیل ہے۔

جہاد کی چوٹی: قتال فی سبیل اللہ

قتال فی سبیل اللہ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی چوٹی اور اس کا ذروۂ سنام ہے۔ یہ مقام محبوبیت ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ (الصّف) ''یقیناً اللہ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔

سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں' اُنہیں مردہ مت کہو' وہ زندہ ہیں' مگر تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور نہیں ہوتا۔''

اور سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴾

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں اُنہیں مردہ نہ سمجھو' وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں' اپنے ربّ کے پاس رزق پا رہے ہیں۔''

یہ وہ اعلیٰ و ارفع مرتبہ ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ اس کی تمنا اور آرزو فرمایا کرتے تھے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ)) (۱)

''میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں''۔

کتبِ احادیث میں نبی اکرم ﷺ کی یہ دعائیں منقول ہیں:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَھَادَةً فِیْ سَبِیْلِکَ))

اور:

((اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَةً فِیْ سَبِیْلِکَ))

لیکن سورۃ المجادلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سنت بیان فرمائی ہے:

﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ (۲۱)

''اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے (یعنی طے فرما دیا ہے) کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ یقیناً اللہ ہی زورآور اور زبردست ہے۔''

رسولوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تحفظ حاصل ہوتا ہے اور وہ مقتول نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ عالَمِ ظاہری میں اس طرح رسول کے مغلوب ہونے کا پہلو نکلتا ہے' البتہ انبیاء علیہم السلام کو یہ خصوصی تحفظ نہیں دیا گیا۔ چنانچہ ان میں سے بعض قتل بھی کیے گئے' جس کی سب سے بڑی مثال حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل ہے۔

ضمناً یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ رفعِ آسمانی کی یہ بھی ایک دلیل ہے' کیونکہ وہ بھی ایک رسول تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بھی ہے کہ جس قوم کی طرف رسول مبعوث کیا جاتا ہے وہ قوم اگر رسول کا انکار کر دے' اس پر صرف معدودے چند لوگ ہی ایمان لائیں تو اہلِ ایمان کو بچا کر اس قوم کو عذابِ استیصال کے ذریعہ اسی دنیا میں ہی تباہ و برباد اور ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ ﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ﴾ بنی اسرائیل نے آنجنابؑ کا انکار کیا لیکن انہیں عذابِ استیصال سے نیست و نابود نہیں کیا گیا۔ یہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے لیے دلیل ہے۔ حضرت مسیحؑ قربِ قیامت میں جناب محمد ﷺ کے اُمتی کی حیثیت سے نزول فرمائیں گے اور ان شاء اللہ انہی کے ہاتھوں تمام یہودی عذابِ استیصال و ہلاکت کا مزہ چکھیں گے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں اور جہاد کی چوٹی قتال ہے۔ البتہ قتال ہر وقت نہیں ہوتا' موقع و محل کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی اسلامی حکومت بالفعل قائم ہو اور اسے غیر مسلموں سے فی سبیل اللہ جنگ کا مرحلہ درپیش ہو اور حالات کے لحاظ سے حسبِ ضرورت فوج موجود ہو یا مزید ضرورت کے لیے لوگ جنگ کے لیے نکل آئیں تو قتال فرضِ عین نہیں فرضِ کفایہ ہو جائے گا۔ لیکن ''جہاد'' وہ چیز ہے جو ایک مسلمان پر شعور کی عمر کو پہنچتے ہی فرض ہو جاتا ہے۔ اس جہاد کے مختلف مدارج ہیں' جن میں سے بعض کا میں قدرے تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں اور بعض کی طرف میں نے محض اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ ''قتال'' اس جہاد کے عمل کی آخری چوٹی اور اس کا ذروۂ سنام ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے لگایئے جو صحیح مسلم میں حضرت

(۱) صحيح البخاری' کتاب التمنی' باب ما جاء فی التمنی ومن تمنی الشهادة۔ وصحيح مسلم' کتاب الامارة' باب فضل الجهاد والخروج فی سبيل الله۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ)) (۱)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اس حال میں مر جائے کہ نہ تو اُس نے اللہ کی راہ میں جنگ کی ہو اور نہ ہی اس کے دل میں اس کا خیال آیا ہو (اس کی تمنا اور آرزو بھی پیدا نہ ہوئی ہو) تو ایسے شخص کی موت ایک نوع کے نفاق پر ہو گی''۔ بقول اقبال ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی

جہاد کے لیے جدید اصطلاح: انقلابی عمل

اگرچہ میں بھی اس بات کا قائل ہوں کہ ہمیں حتی الامکان جدید اصطلاحات سے احتراز کرنا چاہیے اور کتاب وسنت کی اصل اصطلاحات سے چمٹے رہنا چاہیے' عافیت اسی میں ہے' ورنہ بالکل غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر غلط نظریات اذہان میں رینگ کر آ جاتے ہیں اور پیوست ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک یہ دشواری بھی پیش آتی ہے کہ ہر دَور کی اپنی زبان ہوتی ہے' ہر دور کی چند مخصوص اصطلاحات ہیں جو بات کی تفہیم کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اگر اس زبان میں ان اصطلاحات کے ساتھ بات نہیں کی جائے گی تو ابلاغ کا حق ادا نہیں ہو گا۔ لہٰذا میرے نزدیک درمیانی راہ یہ ہے کہ وقتی طور پر ابلاغ اور افہام کے لیے ان اصطلاحات کو استعمال ضرور کیا جائے۔ لیکن اپنے فکر کو مستقلاً اُن اصطلاحات کے حوالے سے استوار کیا جائے جو کتاب وسنت کی ہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر میں یہ بات عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ ''جہاد'' کے لیے آج کے دور کی اصطلاح ہے ''انقلاب''۔ انقلابی عمل ہی دراصل جہاد ہے۔ البتہ اس میں تھوڑا سا فرق واقع ہوتا ہے۔ میں نے جہاد کے حوالے سے جو تین سطحیں (Levels) بیان کی ہیں' انقلابی عمل میں ان کی ترتیب بدل جائے گی۔ جب ہم انقلاب کی بات کریں گے تو سب سے پہلے دعوت کا مرحلہ آئے گا۔ اس لیے کہ ہر انقلابی فکر کی propagation' اس کی نشر و اشاعت' اس کو پھیلانا' اس کو عام کرنا' اسے ذہنوں میں اتارنا' اس کو دلائل کے ساتھ حق ثابت کرنا' اس انقلابی عمل کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طرح درمیانی منزل اب پہلی ہو گئی ہے۔

انقلابی عمل کے لیے تنظیم ناگزیر ہے

انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ کیا ہوتا ہے! یہ کہ جو لوگ اس فکر کو قبول کریں انہیں منظّم کیا جائے۔ اس لیے کہ انقلاب بغیر جماعت کے نہیں آتا۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ انفرادی طور پر دین کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ انفرادی سطح پر تبلیغ ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی سب سے اعلیٰ اور درخشاں مثال حضرت نوح علیہ السلام کی ہے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت دیتے رہے۔ سورۂ نوح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب علیہ السلام نے کس کس طور اور طریقے سے دعوت و تبلیغ کے فریضہ کی انجام دہی کے لیے مساعی کیں اور پھر کتنی حسرت کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ:

﴿رَبِّ اِنِّىْ دَعَوْتُ قَوْمِىْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ﴿۵﴾ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِىْۤ اِلَّا فِرَارًا ﴿۶﴾ وَاِنِّىْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِىْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ﴿۷﴾ ثُمَّ اِنِّىْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ﴿۸﴾ ثُمَّ اِنِّىْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ﴿۹﴾﴾

''اے میرے ربّ! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز تیری طرف بلایا' مگر میری دعوت نے اُن کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے اُن کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے' انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے مُنہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اَڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے انہیں آوازِ بلند دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔''

لیکن قوم مُردہ ہو چکی تھی۔ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ توحید کو قبول نہیں کیا' بلکہ

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب ذم من مات ولم یغزولم یحدث نفسہ بالغزو۔

اس سے اعراض وانکار کیا۔ ساڑھے نو سو برس کی دعوت وتبلیغ کا جو نتیجہ نکلا اس کو سورۂ ہود کی آیت ۴۰ کے آخر میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ ''اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اس (نوحؑ) کے ساتھ ایمان لائے تھے۔'' یہاں ''قلیل'' وہ معنی دے رہا ہے جو انگریزی میں a little دیتا ہے' یعنی بہت ہی کم' معدودے چند۔ قرآن حکیم میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؑ پر ان کے گھر والے ہی ایمان لائے تھے اور ان میں سے بھی ایک بیٹے نے دعوتِ حق قبول نہیں کی تھی' وہ کفر پر ہی اڑا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ انگلیوں پر گنے جانے والے چند اور لوگ بھی ایمان لائے ہوں' بہرحال ساتھی نہ ملے' جمعیت فراہم نہیں ہوئی' لہٰذا اگلا قدم کیسے اٹھتا! اعوان وانصار نہ ہوں تو اگلی منزل کی طرف پیش رفت کیسے ہو! لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی استقامت ومصابرت دیکھئے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت وتبلیغ میں کھپا دیے اور اپنا فرضِ منصبی ادا کر دیا۔ ہمارے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ ایک مخلص شخص اپنی پوری زندگی اس کام میں لگا دے' وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو اور کامیاب ہوگا۔ معاشرہ اگر مر چکا ہے' حق کو قبول کرنے کی صلاحیت معدوم ہو چکی ہے تو کوئی مثبت جواب نہیں ملے گا' ساتھی میسر نہیں آئیں گے۔ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ چونکہ اگلا قدم اٹھانے اور اگلی منزل کی طرف پیش رفت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا' لہٰذا وہ بریٔ الذمہ ہے۔

اسی طرح تربیت وتزکیہ' تدریس وتعلیم اور تصنیف وتالیف یہ سارے کام دین کے ہیں اور یہ انفرادی طور پر بھی ہو سکتے ہیں اور بحمد اللہ ہمارے یہاں یہ سب ہی کام ہو رہے ہیں۔ لیکن جب آخری منزل اور اصل ہدف کی بات ہوگی جس کو میں اب انقلاب سے تعبیر کر رہا ہوں' یعنی دین کا غلبہ' دین کا قیام' دین کا نفاذ' دین کی سربلندی' تو کوئی احمق شخص ہی ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ یہ کام انفرادی طور پر ممکن ہے۔ بلکہ ایسا خیال رکھنے والا شخص فاتر العقل ہی ہو سکتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ تنظیم کے بغیر کوئی اجتماعی کام نہیں ہو سکتا' چاہے وہ خیر کے لیے ہو چاہے شر کے لیے ہو۔ جو اشخاص لوگوں کی جیبیں کاٹتے ہیں' ان کی بھی تنظیم ہوتی ہے۔ ڈاکوؤں کے بھی گروہ (gangs) ہوتے ہیں' تنظیم ہوتی ہے۔ تخریب کاری کے لیے بھی تنظیمیں قائم ہیں۔ لہٰذا اقامت دین اور اظہارِ دین کے لیے تنظیم اور جماعت ناگزیر ہے' اس سے مفر نہیں۔ بقول فیض احمد فیضؔ ؎

جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!

حضرت نوح علیہ السلام کے بالکل برعکس دوسری مثال میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیا کرتا ہوں۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں جن پانچ اولوالعزم رسولوں کا ذکر ہوا ہے' ان میں زمانی ترتیب کے لحاظ سے اوّلین ہیں حضرت نوح علیہ السلام اور آخری ہیں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ درمیان میں تین رسول ہیں' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ f۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام بالکل وسط میں آتے ہیں۔ اب دیکھئے' اوّل وآخر میں کتنی متضاد کیفیت ہے کہ ایک نے ساڑھے نو سو برس دعوت دی' لیکن کوئی اعوان وانصار نہیں ملے۔ جمعیت ہی فراہم نہیں ہوئی تو اگلا قدم کیسے اٹھے! اور دوسرے کا معاملہ یہ ہے کہ کل بیس برس میں دنیا کا عظیم ترین صالح انقلاب برپا فرما دیا۔ میں بیس سال فتح مکہ اور اس کے بعد غزوۂ حنین کی کامیابی کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں' کیونکہ اس کے ساتھ ہی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلابِ اسلامی کی تکمیل ہو گئی تھی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد میں مابہ الامتیاز اور فیصلہ کن چیز کیا ہے! اسے سورۃ الفتح کی آیات ۲۸' ۲۹ کے حوالے سے سمجھئے۔ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۲۸ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ ......﴾

''وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت کاملہ اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے' اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں......''

بقول شاعر مشرق ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

محمد رسول اللہ ﷺ کی جمعیت اور تنظیم کو تصور میں تو لائیے۔ وہ لوگ کہ جن کی دین سے وابستگی اور دین کے لیے ایثار کا یہ عالم تھا کہ وہ اس شان سے نبی اکرم ﷺ کے اعوان وانصار بنے ہیں کہ ع ''ہر چہ بادا باد ما کشتی درآب انداختیم'' والا نقشہ ہے۔ جو غزوۂ بدر سے قبل ایک مشاورت میں کہہ رہے ہیں کہ ''اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ ہم سے کیا پوچھ رہے ہیں! بسم اللہ کیجیے جو بھی آپ کا ارادہ ہو' کیا عجب کہ اللہ ہمارے ذریعے آپ کو آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔ جو کہہ رہے ہیں کہ حضور ﷺ! آپ ہمیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھیوں پر قیاس نہ فرمایئے جنہوں نے کہا تھا:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿٢٤﴾﴾ (المائدۃ)

''پس (اے موسیٰ!) تم جاؤ اور تمہارا ربّ جائے اور دونوں جنگ کرو' ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔''

جہاں آپؐ کا پسینہ گرے گا وہاں اپنا خون بہانا ہمارے لیے سعادت ہوگی۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جملہ یاد کیجیے جو کہہ رہے ہیں کہ حضورؐ! آپ ہم سے کیا مشورہ لے رہے ہیں' اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ۔ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں' ہم آپؐ کی تصدیق کر چکے ہیں' ہم آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کر چکے ہیں۔ اب خدا کی قسم! اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے۔ اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی اونٹنیوں کو دبلا کر دیں گے لیکن برک الغماد تک جا پہنچیں گے (جو عرب کا ایک دور دراز علاقہ ہے جس کی راہ میں لق ودق صحرا پڑتا ہے۔)

یہ ہے وہ فیصلہ کن اور مابہ الامتیاز بات کہ اگر جمعیت نہ ہو' اس میں بنیانِ مرصوص کی کیفیت نہ ہو' اس میں سمع وطاعت کا وصف وجوہر نہ ہو' اس میں نظم وضبط نہ ہو' وہ تربیت یافتہ نہ ہو' اس کو اللہ کی رضا ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہو' اس کو زندہ رہنے سے زیادہ اللہ کی راہ میں جان دینا عزیز نہ ہو تو اگلی منزلوں کی طرف پیش رفت اور پیش قدمی کے مراحل آئیں گے ہی نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ایسے ساتھی نہ ملے' لہٰذا اگلے مرحلے کا معاملہ درپیش ہی نہ ہوا۔ لیکن آنحضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے اعوان و انصار مل گئے جنہوں نے دعوتِ توحید پر لبیک کہا' دعوتِ حق کو قبول کیا' اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا اور انہوں نے دعوت الی اللہ' اعلائے کلمۃ اللہ' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لیے شدائد ومصائب' فقر وفاقہ' کشمکش وتصادم' جہاد وقتال کے مراحل میں جاں نثاری' قربانی وایثار' صبر وتحمل اور استقامت کی وہ مثالیں قائم کیں کہ ان کی نظیر تاریخ انسانی نہ آج تک پیش کر سکی ہے اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی۔ اللہ کی طرف سے حضور ﷺ کو ایسے جاں نثار اصحاب کا ملنا اس لیے بھی تھا کہ اظہار دین الحق آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا' بفحوائے ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾۔ چونکہ آپؐ آخری نبی اور رسول ہیں لہٰذا بنفس نفیس دینِ حق کو ایک نظامِ اجتماعی کی حیثیت سے قائم اور نافذ کر کے تا قیامِ قیامت نوعِ انسانی پر حجت قائم کرنا بھی آپؐ کے فرائض منصبی میں ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔

اب آیئے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کی طرف۔ اولوالعزم من الرسل میں سے بالکل وسط میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ آنجنابؑ کی بعثتیں بھی دونوعیتوں کی حامل تھیں۔ ایک آنجنابؑ آلِ فرعون کی طرف رسول تھے۔ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾﴾ (طٰہٰ) اور دوسرے آپؑ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ آنجنابؑ کی دعا پر آپ کی معاونت کے لیے آپؑ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا گیا تھا۔ مصر میں دونوں حضرات دعوت وتبلیغ اور بنی اسرائیل کی تربیت وتزکیہ میں ہمہ وقت وہمہ تن لگے رہے' حتیٰ کہ فرعون کے اعراض' سرکشی' دشمنی اور انکار کے باعث ہجرت کا مرحلہ آ گیا اور آپؑ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں۔ آپؑ کے ساتھ لاکھوں کی جمعیت تھی۔ جب آپؑ بنی اسرائیل کے ہمراہ صحرائے سینا پہنچے تو اگلا اور آخری مرحلہ دین کے قیام اور غلبہ کے لیے قتال کا درپیش ہوا اور وحیٔ الٰہی کے ذریعے حکم ہوا کہ ارضِ مقدس (فلسطین) میں داخل ہو جاؤ۔ چنانچہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا:

﴿يٰـقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَةَ الَّتِىۡ كَتَبَ اللّٰهُ لَـكُمۡ وَلَا تَرۡتَدُّوۡا عَلٰۤى اَدۡبَارِكُمۡ فَتَـنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ﴾ (المائدۃ)

''اے برادرانِ قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے' اور پشت پھیر کر پیچھے مت پلٹو' ورنہ ناکام و نامراد لوٹو گے۔''

لیکن قوم بزدل اور تھڑدلی نکلی اور اس نے کورا جواب دے دیا:

﴿قَالُوۡا يٰمُوۡسٰۤى اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوۡا فِيۡهَا فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ﴾ (المائدۃ)

''انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ (زبردست لوگ) وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمہارا ربّ' دونوں جاؤ اور لڑو' ہم یہاں بیٹھے ہیں۔''

نتیجہ یہ نکلا کہ انقلابی عمل وہیں رک گیا۔ اگر اقامتِ دین کا کام اجتماعی قوت اور منظّم جمعیت کے بغیر ممکن ہوتا تو اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبروں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام) کے مبارک ہاتھوں سے تکمیل پا جاتا۔ لیکن ساتھیوں کی بزدلی اور پیٹھ دکھانے کے باعث انقلابی عمل تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو اللہ کی طرف سے بشارت دی تھی کہ ارضِ مقدس تمہارے لیے لکھی جا چکی ہے' اب تمہاری ہمت درکار ہے' پیٹھ دکھاؤ گے تو ناکام و خاسر ہو جاؤ گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کی اس ڈھٹائی' نافرمانی' بزدلی اور کورے جواب سے اتنے آزردہ اور دل گرفتہ ہوئے کہ ان کی زبان پر آ گیا:

﴿رَبِّ اِنِّىۡ لَاۤ اَمۡلِكُ اِلَّا نَفۡسِىۡ وَاَخِىۡ فَافۡرُقۡ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ﴾ (المائدۃ)

''اے میرے ربّ! مجھے تو سوائے اپنی ذات اور اپنے بھائی کے کسی اور پر کوئی اختیار نہیں' پس تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں جدائی ڈال دے۔''

قوم کی اس بزدلی اور کم ہمتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے بطورِ پاداش اپنا حکم سنا دیا:

﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيۡهِمۡ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۚ يَتِيۡهُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ﴾ (المائدۃ)

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ان کی نافرمانی اور بزدلی کی وجہ سے) ان پر ارضِ مقدس چالیس سال تک حرام کر دی گئی ہے۔ اب یہ اسی صحرا میں (اس مدت تک) بھٹکتے رہیں گے''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے سبق ملتا ہے کہ اگر جمعیت موجود ہو لیکن وہ غیر منظّم ہو' اس میں سمع و طاعت کا جوہر نہ ہو' اس میں نظم و ضبط نہ ہو تو بھی انقلابی عمل آخری مرحلہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے وہ جماعت درکار ہے جس کے متعلق آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((آمُرُكُمۡ بِخَمۡسٍ: بِالۡجَمَاعَةِ وَالسَّمۡعِ وَالطَّاعَةِ وَالۡهِجۡرَةِ وَالۡجِهَادِ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ)) (۱)

''(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ التزامِ جماعت کا' اور سننے اور ماننے کا' اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا''

ایک اور روایت میں ((آمُرُكُمۡ بِخَمۡسٍ)) کے بعد الفاظ آتے ہیں: ((اَللّٰهُ اَمَرَنِىۡ بِهِنَّ)) ''اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے''۔ اس طرح یہ حکم مزید مؤکد ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اقامتِ دین کے مرحلے کو طے کرنے کے لیے ٹھیٹھ اسلامی اصولِ سمع و طاعت پر مبنی ایک منظّم جماعت ناگزیر ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ جہاد کی میں نے جو سطحیں بیان کی ہیں' اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بھی جماعتی زندگی لازم ہے۔ اکیلا شخص معاشرے کے دباؤ' نفس کی ترغیبات اور ابلیس لعین کی تحریصات کے مقابلے میں مشکل ہی سے ٹھہر سکتا ہے۔

انقلابی دعوت و تربیت اور اس کا ذریعہ

انقلابی جدوجہد میں دعوت کے ساتھ تربیت کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کی اہمیت کو اکبرالہ آبادی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

(۱) مسند احمد ۴/۱۳۰۔ وسنن الترمذی' ابواب الامثال' باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

علامہ اقبال نے اکبرالٰہ آبادی کو اپنا مرشدِ معنوی مانا ہے۔ اسی حقیقت کو اقبال نے جس طرح ادا کیا ہے اس کی اپنی ایک شان ہے۔ فرمایا ہے: ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تُو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو!

اور علامہ کی فارسی شاعری میں یہ مضمون نقطۂ عروج پر آتا ہے۔ ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن!
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!!

یہ تربیت ہے، یہ تزکیہ ہے، یہ تعلق باللہ ہے، یہ رضائے الٰہی کے حصول کی آرزو اور تمنا ہے۔ ان چیزوں سے وہ اجتماعی طاقت وجود میں آتی ہے جس کو سلطنتِ جم پر دے مارنا ہے، جس کو باطل اور طاغوت سے جا ٹکرانا ہے۔

انقلابی عمل کے اگلے تین مراحل وہی ہیں جو بیان ہو چکے ہیں: صبر محض، اقدام اور مسلح تصادم۔ لیکن یہ جو پہلا مرحلہ ہے، جسے انقلابی عمل میں اصل حیثیت و اہمیت اور اوّلیت حاصل ہوتی ہے، اس کے دو مرحلے وہ ہیں جہاں جہاد قرآن کے ذریعے ہوگا۔ پہلا مرحلہ نظریاتی تصادم اور نظریاتی کشمکش کا ہے اور اس کے لیے بندۂ مؤمن کے ہاتھ میں جو تلوار ہے وہ قرآن ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ اس کے ساتھ حکمت بھی ہو۔ فرمایا: ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ کہ اس حکمت کے ذریعے دعوت و تبلیغ ہو۔ یہ قرآن موعظۂ حسنہ بھی ہے۔ فرمایا: ﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ اسی میں جدال بھی ہے۔ مشرکین، ملحدین، منافقین اور اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ کا ذریعہ بھی یہی قرآن ہے۔ سورۃ النحل کی اس آیت میں یہ تمام طریقے نہایت حسین انداز سے آ گئے ہیں: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ﴾ (آیت ۱۲۵) پس قرآن کی تلوار ہاتھ میں لے کر نظریاتی تصادم اور کشمکش کے میدان میں کود پڑو۔ انذار قرآن کے ذریعے سے ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ﴾ (الانعام: ۱۹) تبشیر قرآن کے ذریعے سے ہو۔ میں آپ کو سورۂ مریم کی آیت سنا چکا ہوں جس میں انذار اور تبشیر دونوں کا ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے: ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝﴾ میں اپنے اس احساس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ اس ''بِہٖ'' پر ہمارے اکثر اہلِ علم نے کماحقہٗ توجہ نہیں دی۔ سورۃ الکہف کی پہلی دو آیات میں بھی نہایت خوبصورت اسلوب سے انذار و تبشیر کے لیے ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝﴾

''کُل حمد و ثنا اور شکر و سپاس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب، تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے۔''

تذکیر ہو تو قرآن سے ہو۔ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝﴾ (قٓ) ''پس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اُس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہہ سے ڈرے''۔ معلوم ہوا کہ دعوت و تبلیغ کہہ لیں یا نظریاتی تصادم و کشمکش کہہ لیں، اس کا ذریعہ، اس کا آلہ قرآن ہے۔ جبکہ ہم نے تو اِس قرآن کو وعظ کا ذریعہ بھی نہیں بنایا۔ اقبال نے اس کا مرثیہ کہا ہے ؎

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو

با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو

یعنی واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھتا ہے۔ اس کے الفاظ بھی پرشکوہ اور بلند و بالا ہوتے ہیں لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے۔ اس کا سارا وعظ قرآن کے بجائے خطیب بغدادی اور دیلمی سے ماخوذ ہوتا ہے اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف‘ شاذ اور مرسل روایات سے رہ گیا ہے۔ ہمارے عام واعظین نہ معلوم کہاں کہاں سے ضعیف حدیثیں لاتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے ہمارے دور میں ضعیف حدیثوں کے حوالے سے تبلیغ ایک باقاعدہ ادارے کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ فضائل کے بیان اور نیکیوں کی تلقین کے لیے اولیائے کرامؒ کی غیر مصدقہ کرامات کا ذکر ہے۔ وعظ و نصیحت کے لیے ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کا سہارا ہے‘ حالانکہ موعظۂ حسنہ تو یہ قرآن ہے۔ دل کی کایا پلٹ دینے کے وصف کا حامل یہ قرآن ہے‘ لیکن تلقین یہ کی جاتی ہے کہ اس کو سمجھنا بھی مت! تفسیر تو درکنار اس کا ترجمہ بھی نہ پڑھنا! اس کی تو بس تلاوت کر کے ثواب حاصل کر لیا کرو! وعظ و نصیحت کے لیے ضعیف روایات یا بے سروپا قصے کہانیاں ہیں‘ جن کو ایک عام معقول انسان کا ذہن بھی قبول نہ کرے اور ان کو تسلیم کرنے پر اس کا دل تیار نہ ہو۔ اس کے ذریعہ سے ابلاغ کیا ہوگا؟

جیسے کہ میں نے عرض کیا‘ انقلابی عمل میں پہلا مرحلہ دعوت کا ہے‘ جس کے لیے نظریاتی تصادم میں ہماری تلوار قرآن ہے اگرچہ اس کا حق ادا کرنا اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) کی بشارتِ نبویؐ کو چند سعید روحیں اپنا مقصدِ زندگی بنائیں۔ اُن کو اس کے لیے زندگیاں لگانی ہوں گی۔

دوسرا مرحلہ ہے تربیت۔ اس کے لیے بھی ہمارے پاس اصل تلوار قرآن ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ قرآن مدعی ہے اس حقیقت کا کہ ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ میں ہوں۔ لیکن ہم نے تزکیۂ نفس کے لیے کہاں کہاں بھیک مانگی ہے اور پھر اس کے لیے فلسفے اور پورے پورے نظام مدوّن کیے ہیں۔ مگر اِس کوچے میں گزر نہیں ہے تو قرآن کا نہیں ہے۔ اقبال نے اس کا بھی نوحہ کیا اور مرثیہ کہا ہے۔

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

''پشمینہ پوش صوفی اپنے حال میں مست اور قوالی کی شراب سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقی کے شعر سے آگ بھڑک اُٹھتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں ہے''۔

اور بالفرض کچھ ہو بھی تو اس کا کوئی اثر نہیں‘ جو مدعی ہے ''شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ'' ہونے کا اور جس کے بارے میں اُس کا نازل کرنے والا خود ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (بنی اسراء یل:۸۲)

''ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو اہل ایمان کے لیے شفا اور رحمت ہے۔''

لیکن اس کی ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ہم نے سارے کوچے کھنگال لیے‘ در در سے بھیک مانگ لی‘ لیکن یہ دروازہ بند ہے۔ حالانکہ تربیت و تزکیہ بھی اسی قرآن کے ذریعے ہوگا! میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کو بھی اس دور میں اقبال نے خوب پہچانا ہے۔ میں علمائے کرام کی عظمت اور ان کے مقام و مرتبہ کا معترف ہوں‘ لیکن اس حقیقت کو بیان کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ان حقائق کا جو انکشاف اقبال پر ہوا ہے اور ان کا جو شعور و ادراک علامہ کو حاصل ہوا ہے وہ مجھے اس دور میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ کس خوبصورتی سے کہتے ہیں:

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی

کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

''شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ وہ انسان کے دلوں میں ڈیرا لگا لیتا ہے اور اس کی رسائی انسان کے دل کی گہرائیوں تک ہے۔ بہتر راستہ یہ ہے کہ اسے قرآن کی حکمت و ہدایت کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنا لیا جائے''۔

غور کیجیے ہر شعر میں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مفہوم کو کس خوبی سے سمو دیا ہے! یہ حدیث نبویؐ گزر چکی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ)) (متفق علیہ)

''شیطان انسان کے وجود میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے کہ خون''۔

پہلے شعر میں اس کا حوالہ ہے۔ دوسرا شعر بھی ایک حدیثِ نبویؐ سے ماخوذ ہے۔ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ کسی صحابی نے بڑی ہمت اور جرأت کی (اللہ تعالیٰ انہیں اجر دے' وہ دریافت نہ کرتے تو یہ حکمت ہم تک کیسے پہنچتی) انہوں نے سوال کیا کہ حضور ﷺ! کیا آپ کے ساتھ بھی ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: ''ہاں ہے' لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے!'' یہ ہے وہ بات جو دوسرے شعر میں علامہ نے کہی ہے کہ اس قرآن کی شمشیر سے گھائل کر کے شیطان کو مسلمان بنایا جا سکتا ہے۔

اگر زہر ایسا ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے تو یہ قرآن بھی وہ تریاق ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے۔ ظاہر ہے اگر تریاق زہر سے زیادہ مؤثر نہ ہو تو زہر کا اثر کیسے زائل ہو گا! اس بات کو بھی اقبال نے اس طرح کہا ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

یعنی یہ قرآن جب کسی کے اندر سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ اب وہ انسان بالکل بدلا ہوا انسان بن جاتا ہے۔ یہ باطنی انقلاب ہے' اندر کی تبدیلی ہے۔ یہ باطنی انقلاب' یہ اندر کی تبدیلی ایک عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بنتی ہے' ورنہ انقلاب کہاں سے آئے گا۔ ''جہاں دیگر شود'' کا اصل مفہوم تو یہ ہو گا کہ جس انسان کے اندر قرآن کے ذریعے تبدیلی آ گئی اس کے لیے جہاں بدل گیا' اس کی دیکھنے والی نگاہ بدل گئی' اس کا زاویہ نظر بدل گیا' اس کی اقدار بدل گئیں۔ اب اس کے لیے یہ جہاں وہ نہیں ہے' بلکہ ''جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا یہ عالم پیر مر رہا ہے'' والا معاملہ ہے۔ جب کسی کے دل میں قرآن اتر جائے تو اس کے لیے اب یہ عالم نیا عالم ہے۔ اس کا نقطۂ نظر اور مطلوب و مقصود بدل گیا ہے۔ اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اگر ایسے فدائین کی ایک منظم جماعت وجود میں آ جائے جن کے دلوں میں قرآن جاگزیں ہو جائے تو یہ تبدیلی عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اندر جوشِ ایمانی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ اسی قرآن کی بدولت ہی پیدا ہوا تھا۔ یہ مختصر سی اور بے سروسامان جماعت ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار لے کر کسریٰ و قیصر یعنی وقت کی دو عظیم سلطنتوں سے جا ٹکرائی تھی اور بیس سال کے مختصر عرصہ میں اول الذکر کو بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دیا تھا' جبکہ آخر الذکر کو مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ سے بالکلیہ بے دخل کر دیا تھا اور ان علاقوں پر اللہ کے دین کا جھنڈا لہرانے لگا تھا۔

حاصلِ کلام یہ کہ انقلابی عمل کی دو سطحیں ہیں' یا یوں کہہ لیں کہ جہاد کے دو Levels ہیں۔ مجاہدہ مع النفس کے لیے ہمارا آلۂ جہاد قرآن ہے اور نظریاتی کشمکش اور تصادم کے لیے بھی ہماری تلوار قرآن ہے۔

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اسی جہاد بالقرآن کا عزم لے کر میں ۱۹۶۵ء کے اواخر میں ساہیوال سے لاہور منتقل ہوا تھا' ورنہ ۱۹۵۴ء میں لاہور سے ایم بی بی ایس کر کے میں ساہیوال میں مقیم ہو گیا تھا۔ لاہور آ کر میں نے بالکل تن تنہا اس کام کو شروع کیا۔ اُس وقت کوئی ساتھی' کوئی ادارہ اور کوئی انجمن نہیں تھی۔ ''میثاق'' کا چارج سنبھالا تو تنہا خود ہی اس کا ایڈیٹر' خود ہی مالک' خود ہی پروف ریڈر' حتیٰ کہ خود ہی اس کا کلرک اور چپڑاسی۔ پھر دارالاشاعت الاسلامیہ قائم کیا تو وہ بھی تنہا' وہی ''میثاق''

والی صورت حال تھی۔ ساتھ ہی مولانا حسرت موہانی کے اس مصرعہ ع ''ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی'' کے مصداق مطب بھی کر رہا تھا، نبضیں بھی دیکھ رہا تھا اور نسخے بھی لکھ رہا تھا۔ اسی دوران کئی علاقوں میں مطالعۂ قرآن کے حلقے قائم کیے اور منتخب نصاب کا درس شروع کیا۔ قرآن کی دعوت کا یہ اعجاز کہ اعوان و انصار ملتے چلے گئے۔ ۱۹۷۲ء کے اوائل میں میں نے میثاق میں ''مرکزی انجمن خدام القرآن'' اور اس کے زیرِ انتظام قرآن اکیڈمی کے قیام کا خاکہ پیش کیا۔ الحمدللہ بعض دردمند اور اہلِ دل حضرات نے اس پر لبیک کہی اور ۱۹۷۲ء کے وسط میں باقاعدہ انجمن قائم ہوگئی۔ میں نے انجمن کے خاکے اور پھر دستور کی تقدیم میں یہ شعر درج کیا تھا ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں!
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

الحمدللہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۴ء تک قریباً بارہ سال انجمن کے قیام پر گزر گئے ہیں۔ اس عرصہ میں جو بھی بن پایا ہے اور جس کام کی بھی اللہ کی طرف سے توفیق ملی ہے وہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ انجمن کا قیام، اس کے لیے دفاتر، رہائشی کوارٹرز، ہاسٹل، جامع القرآن قرآن اکیڈمی کی تعمیرات، علوم ومعارفِ قرآن کی نشر واشاعت کے لیے مکتبہ کا قیام، دعوت رجوع الی القرآن کا پیغام پہنچانے کے لیے پاکستان کے دوسرے شہروں کے دورے اور دروس وخطابات کے ذریعے دین کے جامع تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش، قرآن کانفرنسوں اور محاضراتِ قرآنی کا انعقاد، مختلف شہروں میں قرآنی تربیت گاہوں کا انتظام، ساتھ ہی اسی پیغام کے لیے بیرون پاکستان کے اسفار، میں نے یہ کام صرف اس مقصد کے لیے گنوائے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ ان سب کاموں کو آپ ''جہاد بالقرآن'' کے عنوان کے تحت اپنے حافظے میں درج کرلیں۔

ایک وقت وہ بھی آیا جب خالصتاً اللہ ہی کی طرف سے اس دور کے سب سے موثر ذریعۂ ابلاغ ٹیلی ویژن پر پورے پندرہ ماہ تک ''الہدیٰ'' کے نام سے قرآن مجید کا پیغام ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا۔ پہلی مرتبہ جب اسلام آباد سے ٹی وی کے ایک پروڈیوسر صاحب مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے دفتر میں رمضان المبارک میں روزانہ ''الکتاب'' کے عنوان سے تقاریر کی تجویز لے کر تشریف لائے تو اُس وقت انجمن کی مجلسِ منتظمہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر ان سے ملنے گیا۔ انہوں نے کہا کہ پورے رمضان میں روزانہ بارہ منٹ کا ''الکتاب'' کے عنوان سے ایک پروگرام ہو گا، اس میں آپ کو ایک پارے کے بارے میں کچھ بیان کرنا ہوگا۔ میں نے کہا مجھے ایک آیت کے لیے بسا اوقات ایک گھنٹہ درکار ہوتا ہے اور آپ ایک پارے کے لیے مجھے بارہ منٹ عطا کر رہے ہیں، میں اس مختصر سے وقت میں کہوں گا کیا؟ میں نے معذرت کی کہ مجھ میں اس کی نہ صلاحیت ہے اور نہ جرأت۔ آپ کسی اور کو تلاش کیجئے۔ میں دفتر والوں سے یہ کہہ کر کہ ان کی چائے وغیرہ سے تواضع کر کے ان کو رخصت کر دو، انجمن کے اجلاس میں واپس آ گیا۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ کون صاحب تھے؟ کیا معاملہ تھا؟ میں نے جب بتایا تو سب اراکین میرے سر ہو گئے کہ آپ نے یہ کیا کیا، وہ پانچ منٹ بھی دیں تو ضرور لے لیں! وہ اس ذریعۂ ابلاغ کی اہمیت سے واقف تھے۔ بہرحال اراکین کے اصرار پر میں دوبارہ اٹھ کر گیا، وہ صاحب ابھی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ساتھیوں کے اصرار پر میں یہ پیشکش منظور کرتا ہوں۔

چنانچہ دو سال رمضان المبارک میں روزانہ ''الکتاب'' کا پروگرام ٹی وی پر نشر ہوا، پھر تیسرے سال رمضان ہی میں ''الٓمّٓ'' سیریز چلی، پھر ''الہدیٰ'' کا ہفتہ وار پروگرام نشر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے یہ راستہ پیدا فرما دیا۔ پھر بالکل درمیان میں ''الہدیٰ'' کا پروگرام ختم ہوگیا۔ درمیان میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ میں اس پروگرام میں ''مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' سلسلہ وار بیان کر رہا تھا۔ وہ نصف ہوا تھا کہ اچانک اس پروگرام کو بند کر دیا گیا۔ لیکن میں قطعی مطمئن ہوں کہ یہ اللہ ہی کا فیصلہ ہے اور اس میں یقیناً خیر ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴾ (البقرة)

''ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے''۔

اس ''الہدیٰ'' کے پروگرام کے ذریعے ملک بھر میں ایک پیاس پیدا ہوگئی۔ لوگوں کی یہی پیاس ہے جو مجھے کھینچ کر جگہ جگہ لے جارہی ہے اور عرصہ سے صورت حال یہ ہے کہ میں عموماً لاہور سے ہفتہ کی صبح کو نکلتا ہوں اور جمعرات کی رات یا جمعہ کی صبح کو یہاں واپس پہنچتا ہوں۔ اگر آج شہر شہر جا کر میں قرآن کا پیغام پہنچا رہا ہوں تو ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ''الہدیٰ'' کے پروگرام کو بنایا' ورنہ ہمیں کون جانتا تھا' اور اگر ہم پچاس برس بھی لگے رہتے تو اپنے محدود ذرائع و وسائل سے اتنا وسیع حلقۂ تعارف پیدا نہیں ہوسکتا تھا اور معاشرے میں اتنی پیاس پیدا نہیں ہوسکتی تھی جو بظاہر احوال نظر آ رہی ہے۔

بہرکیف میں گفتگو کے اختتام سے قبل عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی ہمارا ذریعۂ دعوت ہے۔ نظریاتی تصادم اور کشمکش کے لیے ہماری تلوار قرآن حکیم ہے۔ جہاد بالقرآن ہی ہمارا طریقۂ کار ہے۔ نفس اور شیطان سے کشمکش کے لیے بھی ہمارے ہاتھ میں واحد تلوار قرآن مجید ہے۔ تزکیہ نفس کے لیے قرآن نے جو پروگرام دیا ہے' اس میں دو مؤثر ترین چیزیں ہیں' ایک قیام اللیل' دوسری اس قیام میں ترتیل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت و قراءت۔ ابتدا میں قیام اللیل کا حکم اطلاقی شان کے ساتھ آیا تھا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝﴾ (المزّمّل)

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے (ﷺ)! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم۔ آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کرلو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔''

بعد میں جب اس نے ایک معین شکل اختیار کی تو حکم آیا:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (بنی اسراء یل:۷۹)

''اور رات کو اِس (قرآن) کے ساتھ قیام کرو' یہ تمہارے لیے نفل ہے''۔

رات کا جاگنا اور مجرد جاگنا نہیں' بلکہ قیام میں قرآن کی طویل قراءت و تلاوت' یہ دو ہتھیار ہیں جن سے ایک بندۂ مؤمن کی جہاد بالقرآن کے لیے سیرت کی تعمیر ہوتی ہے اور اس دعوتِ موعظہ اور مجادلہ میں تأثیر پیدا ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس قرآن کو ہاتھ میں لے کر ہمیں باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے اور خود اپنے شیطان اور اپنے نفس سے لڑنے کے لیے اس قرآن کی تلوار کو استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰهُمَّ آنِسْ وَحْشَتَنَا فِيْ قُبُوْرِنَا' اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ' وَاجْعَلْهُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً ' اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا' وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ آنَاۤءَ الَّيْلِ وَآنَاۤءَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَّا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ○○

❁ ❁ ❁

جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ

الحمد للہ و کفی والصلوۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی
خصوصا علی افضلھم سید المرسلین خاتم النبیین
محمدٍ الامین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین...... امَّا بَعد:

فاعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرًا ۙ﴿۱﴾﴾

﴿وَقَالَ الرَّسُوۡلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا ھٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَھۡجُوۡرًا ﴿۳۰﴾﴾

﴿فَلَا تُطِعِ الۡکٰفِرِیۡنَ وَجَاھِدۡھُمۡ بِہٖ جِھَادًا کَبِیۡرًا ﴿۵۲﴾﴾ (الفرقان)

﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ص﴾ (آل عمران:۱۰۳)

صدق اللہ العظیم

خطبۂ مسنونہ ٗ تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

میں نے جہاں تک غور کیا ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہماری دینی، ملّی، قومی اور معاشرتی زندگی میں اِس وقت پانچ محاذ ایسے ہیں جو جہاد بالقرآن کے شدید طور پر متقاضی ہیں۔ رہا مسلمانوں سے باہر کا دائرہ تو وہ ابھی بڑی دُور کی بات ہے۔ پہلا مسئلہ تو ''Physician heals thyself'' کے مصداق خود اپنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو پوری نوعِ انسانی کی ہدایت ورہنمائی کے لیے برپا فرمایا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ﴾ ''تم وہ بہترین امت ہو جس کو نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے''۔ دنیا کی دوسری قومیں اپنے لیے جیتی ہیں لیکن تمہیں ان کے لیے جینا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے؟

ہماری مثال تو اس ساقی کی سی ہے جس کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا جامِ ہدایت تھما دیا ہے اور ایک ایک فردِ نوعِ بشر کو اس سے سیراب کرنا ہماری ذمہ داری ٹھہرائی ہے۔ لیکن میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ تو بہت دور کی بات ہے۔ اِس وقت یہ خیرِ اُمت اور اُمتِ وسط خود کئی طرح کے ذہنی، فکری، اعتقادی، نفسیاتی، جذباتی اور عملی انتشار سے دوچار ہے اور اسے مختلف روگ لگ گئے ہیں۔ یہ اس وقت نہایت مہلک اور مزمن امراض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اور یہ کوئی دو چار برس کی بات نہیں ہے، ہمارا یہ زوال وانحطاط صدیوں پر پھیلا ہوا ایک عمل ہے۔

لہٰذا پہلی اور مقدم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی ملّت اور معاشرے کے دائرے کے اندر جائزہ لیں کہ اِس وقت وہ کون کون سے فکری، نظریاتی اور عملی محاذ ہیں جن پر ہمیں قرآن مجید کی شمشیرِ برّاں کو ہاتھ میں لے کر صف آراء ہونا ہے اور ان کے بارے میں ہمیں قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے کیا بنیادی واساسی ہدایات ملتی ہیں۔ نیز ان ہدایات کے انطباق کے عملی طریقے اور تقاضے کیا ہیں؟ اس مسئلہ پر غور وفکر کے نتیجے میں اس وقت پانچ محاذ میرے سامنے آئے ہیں۔

محاذ اوّل

جاہلیّتِ قدیمہ

اس ضمن میں سب سے بڑا محاذ جاہلیّت قدیمہ کا ہے۔ بڑا اس اعتبار سے کہ یہ ہمارے عوام کی اکثریت کا معاملہ ہے۔ عوام الناس کی بڑی عظیم اکثریت کے اندر جاہلیّتِ قدیمہ رچی بسی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ جاہلیّتِ قدیمہ کی اس اصطلاح کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ قرآن مجید اور احادیث شریفہ کی رو سے اسلام سے پہلے کے دور کو ''دورِ جاہلیّت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی حقانیت، صداقت اور ہدایت کے برعکس جو کچھ بھی پہلے تھا اور جو کچھ اب ہے وہ ''جاہلیّت'' ہے۔

جاہلیّت کو جہالت کے معنوں میں مت لیجیے گا، یہ غلط مبحث ہو جائے گا۔ ویسے

جہالت کے بھی عربی میں وہ معنی نہیں ہیں جو ہم اُردو میں استعمال کرتے ہیں۔ اُردو میں ہم اَن پڑھ انسان کو جاہل کہتے ہیں‘ یعنی عالم کے مقابلے میں اُردو میں جاہل کا لفظ مستعمل ہے‘ جبکہ عربی میں جاہل کا لفظ حلیم کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ ایک وہ انسان ہے جو بردبار ہے‘ صاحبِ عقل ہے‘ غور وفکر کرتا ہے‘ محض جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا‘ بلکہ عقل کی رہنمائی میں فیصلے کرتا ہے اور اسی کے مطابق اپنی زندگی کا رُخ متعین کرتا ہے۔ عقلی دلیل کی بنیاد پر کسی بات کو قبول یا مسترد کرتا ہے۔ یہ ہے حلیم انسان۔ اور ایک شخص وہ ہے جو جذباتی ہے‘ اکھڑ ہے‘ غیر مہذب ہے‘ ناشائستہ ہے‘ شہوات وجذبات کی رَو میں بہہ جاتا ہے۔ اس کی عقل پر تعصّبات وخواہشات کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا شخص پی ایچ ڈی ہو‘ بہت تعلیم یافتہ انسان ہو‘ لیکن اسلام کی رُو سے یہ شخص جاہل ہے۔ جاہل سے ’’جہالت‘‘ بنے گا‘ لیکن اسی لفظ جہل سے ’’جاہلیّت‘‘ کی اصطلاح بنتی ہے‘ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کے ماوراء اور اسلام کے سوا جو کچھ ہے اور جو کچھ تھا!

جاہلیّتِ قدیمہ کے اجزائے ترکیبی

اِس جاہلیّت کو میں اس وقت دو حصوں میں تقسیم کرکے آپ حضرات کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ ایک جاہلیّت قدیمہ ہے۔ یہ وہ جاہلیّت ہے جو عرب معاشرے میں اُس وقت نہایت غالب عنصر کی حیثیت سے موجود تھی جس وقت نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔ یہ جاہلیّت قدیمہ دو چیزوں سے مرکب تھی۔ ایک شرک‘ یعنی مشرکانہ اوہام‘ جو توحید کی ضد ہے۔ اور دوسرے ’’شفاعت باطلہ‘‘ کا تصور وعقیدہ‘ جو ایمان بالآخرۃ کی ضد ہے۔

جاہلیّتِ قدیمہ میں اللہ کا انکار نہیں تھا۔ مشرکین مکّہ اللہ کو مانتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والا شخص جو گاہ بگاہ بھی ترجمہ دیکھ لیتا ہے اُس پر یہ حقیقت روشن ہوگی کہ قرآن نے متعدد بار یہ بات کہی ہے کہ اے نبیؐ! اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو یہ لوگ فوراً پکار اٹھیں گے کہ اللہ نے![1] اور

(۱) ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط﴾ (لقمان:۲۵)

اے نبیؐ! اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان سے بارش کون برساتا ہے اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین سے نباتات کون اُگاتا ہے تو فوراً کہیں گے کہ اللہ![1]۔ تو وہ اللہ کے منکر نہیں تھے۔ البتہ انہوں نے اللہ کے ساتھ دیگر معبودوں کی ایک فوج تصنیف کر رکھی تھی۔ کہیں وہ اللہ کے ساتھ جنات کو پوجتے تھے‘ کہیں انہوں نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے کر اُن کے نام پر دیویاں تراش لی تھیں اور ان کے لیے استھان بنا لیے تھے‘ جہاں وہ چڑھاوے چڑھاتے تھے‘ وہاں جا کر منتیں مانتے تھے اور دعائیں کیا کرتے تھے۔ یہ تھا ان کا شرک! یہ شرک آج بھی آپ کو اپنے عوام میں بتمام وکمال ملے گا‘ ایک شوشے کا فرق نہیں ہے۔ اس شرک نے صرف ہیئت بدل لی ہے کہ آج پتھر کی بنی ہوئی مورتیاں سامنے نہیں رکھی جاتی ہیں‘ لیکن قبروں کے ساتھ وہی معاملہ ہو رہا ہے جو اُس دَور میں بتوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ سرمو فرق نہیں۔ عرسوں کے نام سے یہ جو بڑے بڑے میلے ہوتے ہیں ذرا ان میں جا کر دیکھئے کہ وہاں کیا ہوتا ہے! میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ نے عرب کے دورِ جاہلیّت کے میلوں کی رودادیں پڑھی ہوں تو وہ شاید ان سے کہیں پیچھے رہ جائیں۔ تو اس جاہلیّتِ قدیمہ کا ایک جزو تو یہ شرک ہے!

جاہلیّت قدیمہ کا دوسرا جزو شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ وتصور ہے۔ جب ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ تم مانتے ہو کہ اللہ ہی خالق ہے‘ اللہ ہی مالک ہے‘ اُسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے‘ اُسی نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے تو ﴿فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ﴾ [2] اور ﴿فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ﴾ [3] یہ سب کچھ مان کر کہاں سے اندھے ہوئے جا رہے ہو؟ کہاں سے پھرائے جا رہے ہو؟ کہاں سے تمہیں اُچکا جا رہا ہے؟ تمہاری مت کیوں ماری جا رہی ہے؟ اس کے جواب میں قرآن مجید نے ان کے متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔ سورۂ یونس میں ان کا یہ قول نقل

(۱) ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط﴾ (العنکبوت:۶۳)

(۲) ﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ م لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ز فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴾ (غافر)

(۳) ﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ز فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۶﴾ (الزمر)

ہوا: ﴿وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۸) کہ ہم ان بُتوں کو خالق اور مالک تو نہیں مانتے، لیکن ہم کچھ برگزیدہ ہستیاں ضرور مانتے ہیں جن کے نام پر ہم نے یہ بُت بنا لیے ہیں۔ یہ ہستیاں مقربین بارگاہِ ربّ العزت ہیں۔ یہ اللہ کے لاڈلے اور چہیتے ہیں۔ فرشتے جن کو ہم نے دیویاں بنایا ہے، یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اور بیٹیاں بہت لاڈلی ہوتی ہیں، کوئی لاڈلی بیٹی اگر فرمائش کرے تو کوئی باپ اس کی فرمائش کو ردّ نہیں کرتا۔ لہٰذا ہم جو اِن بُتوں کو پوجتے ہیں تو صرف اس لیے کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی بنیں گے، ہماری شفاعت کریں گے اور وہاں ہمیں چھڑوالیں گے۔ گویا اللہ کے عدل وانصاف کے آگے یہ روک بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الزمر کی تیسری آیت میں ان کے اس باطل عقیدے کا ذکر فرما کر اس کی قطعی طور پر نفی فرما دی۔ وہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝۳﴾

”آگاہ رہو کہ دینِ خالص اللہ ہی کا حق ہے (ہر نوع کی عبادت واطاعت کا سزاوار اور مستوجب و مستحق صرف اللہ ہے)۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسروں کو اپنا پشت پناہ اور مددگار بنا رکھا ہے (اس یقین کے ساتھ) کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں (وہ اللہ کے ہاں ہمارے اور اُس کے درمیان عفو ومغفرت کا واسطہ اور ذریعہ بن جائیں اور ہمیں اس کا قرب دلا دیں۔ اے نبیؐ، ان کو متنبہ کر دیجیے کہ) اللہ اُن کے درمیان ان تمام باتوں کا (آخرت میں) فیصلہ فرما دے گا جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا، منکرِ حق اور ناشکرا ہو“۔

تو وہ لوگ آخرت کے منکر نہیں تھے، البتہ آخرت میں محاسبہ سے محفوظ رہنے کے لیے شفاعتِ باطلہ کا تصور رکھتے تھے۔

یہ دو چیزیں یعنی شرک اور شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ اصلاً تو ایک ہی ہے۔ انہیں تصویر کے دو رُخ کہہ لیجیے۔ میں نے بغرضِ تفہیم انہیں علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے کہ جاہلیّت قدیمہ ان دو اجزاء سے مرکب تھی۔ قرآن مجید میں اس جاہلیّت قدیمہ کا ذکر نہایت جلی انداز میں ہے۔ چونکہ اُس دور میں یہی شرک غالب تھا اور اصل گمراہی یہی تھی، لہٰذا مکی سورتوں کا سب سے بڑا مضمون یہی ہے۔ اور جن حضرات کو بھی قرآن مجید سے شغف ہے وہ اس بات کو جانتے ہوں گے کہ قرآن مجید کا دو تہائی حصہ مکی سورتوں پر مشتمل ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار مختلف پیرایوں اور مختلف اسالیب میں، مختلف انداز سے اس شرک اور شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔ کہیں تمثیلات کے انداز میں سمجھایا جا رہا ہے، کہیں عقلی دلائل کے ذریعے سے جھنجھوڑا جا رہا ہے، کہیں ان ہی کے موقف سے اُن پر حجت قائم کی جا رہی ہے۔ سورۃ الکہف میں تصریف الآیات کے متعلق جو الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ﴾ (آیت ۵۴) اور ذرا سی ترتیب کی تبدیلی کے ساتھ یہی بات سورۃ الاسراء میں بایں الفاظ آتی ہے: ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ﴾ (آیت ۸۹)۔ یہ الفاظ اس بات کے اظہار کے لیے آئے ہیں کہ ہم نے کوئی طرزِ اسلوب اور کوئی اندازِ بیان چھوڑا نہیں ہے کہ جس کے ذریعے اس ضلالت وگمراہی کی نفی نہ کر دی ہو اور اس کا ابطال نہ کر دیا ہو۔ آج اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر اپنے معاشرے کا تنقیدی جائزہ لے تو اسے صاف نظر آ جائے گا کہ ہمارے معاشرے کی عظیم اکثریت بھی انہی دونوں گمراہیوں میں مبتلا ہے۔ اس عظیم اکثریت کا دین اولیاء پرستی، عرس میلے اور تعزیہ پرستی کا دین ہے، قبروں پر حاضری اور وہاں چڑھاوے چڑھانے، منتیں ماننے اور دعائیں مانگنے کا دین ہے۔ نماز روزہ تو اس دین میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ اگر ہو جائے تو بڑی بات ہے، ورنہ یہ اس عوامی دین کے لزوم میں داخل نہیں۔ یہ اکثریت اس وہم میں مبتلا ہے کہ یہ اولیاء کرام جن کی قبروں پر ہم نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، آخرت میں ہمارے سفارشی بن جائیں گے، اور پھر ہمارے سب سے بڑے شفیع خود رسول

اللہ ﷺ ہوں گے جن کے ہم نام لیوا ہیں۔ چنانچہ کسی محاسبۂ اُخروی کے خوف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جاہلیّتِ قدیمہ کے خلاف قرآن کی تلوار کا استعمال

پہلا محاذ یہ جاہلیّت قدیمہ ہے جس کے خلاف ہمیں تلوار اٹھانی ہوگی۔ لیکن تلوار کون سی؟ قرآن کی تلوار!...... اس محاذ پر ابلیس کے اس فریب و اغوا کے لیے قرآن ہی تلوار کا کام دے گا۔ میں اس موضوع پر علامہ اقبال کے یہ اشعار بارہا آپ کو سنا چکا ہوں جن میں درحقیقت دو احادیث کی ترجمانی کی گئی ہے ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است — زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی! — کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

میں سمجھتا ہوں کہ اس جاہلیّت قدیمہ کے محاذ کے لیے کسی دقیق یا بھاری بھرکم علمی منصوبے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر صرف دورۂ ترجمہ قرآن کی مہم ہمارے معاشرے میں چل جائے تو وہ لوگوں کے عقائد کی تطہیر کے لیے کافی ہو جائے۔ اس کے لیے دقیق وعمیق تفاسیر کی ضرورت نہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے یہاں ایک کام عظیم پیمانے پر ہو رہا ہے، لیکن کاش کہ وہ کام فضائل سے متعلق ضعیف و شاذ روایات سے بلند تر ہو اور اس کا تعلق ترجمۂ قرآن کے ساتھ قائم ہو جائے کہ ہر مسجد میں فرض نمازوں کے بعد لوگ جمع ہو جائیں اور قرآن حکیم کے متن کے ساتھ کوئی مستند ترجمہ لوگوں کو سنایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ (اِن شاء اللہ العزیز) قرآن مجید کے متن کے ساتھ مجرد ترجمہ اس جاہلیّتِ قدیمہ کا قلع قمع کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ اس کے لیے قرآن حکیم کی حکمت کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زنی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر سمندر میں کہیں تیل گر جائے، فرض کریں کہ تیل کا کوئی ٹینکر پھٹ جائے تو تیل سطح سمندر کے اوپر ہی رہتا ہے۔ بالکل اسی طریقے سے قرآن مجید میں جاہلیّت قدیمہ کا جو ابطال اور اس کی جو تردید ہے اور توحید خالص کی جو دعوت اور اس کے لیے جو استدلال ہے وہ بالکل سطح پر ہے، سامنے موجود ہے۔ اس کے لیے گہرائی میں اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تو یہ بات جان لیجیے کہ اس محاذ پر جب تک قرآن مجید کے ساتھ جہاد نہیں ہوگا تب تک مشرکانہ اوہام اور شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی تردید ممکن نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے یہاں فرقہ وارانہ انداز سے ان عقائد کے حاملین پر جو تنقیدیں ہوتی ہیں اور جس انداز سے ان کی نفی کی جاتی ہے، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس طرح تو ضد اور ہٹ دھرمی میں اضافہ ہوتا ہے اور کدورت اور تلخی مزید پختہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ پھر وہاں معاملہ آ جاتا ہے فرقہ وارانہ عصبیت اور فرقہ وارانہ مفادات کا۔ چنانچہ اس رنگ اور اس انداز میں تردید کرنا اور چند مخصوص چیزوں کو نشانہ بنا کر انہی پر مسلسل گولہ باری کرتے چلے جانا، اس سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ قرآن مجید نے اس مسئلہ کا جو "Panoramic View" لیا ہے اور اسے اس کے وسیع پس منظر میں جس قابلِ فہم اور فصیح و بلیغ انداز اور بدیہیاتِ فطرت کے تاروں کو چھیڑنے والے اسلوب میں بیان کیا ہے، اس کے مقابل میں کون مسلمان یہ گمان کر سکتا ہے کہ وہ اس سے بہتر اور دلنشین انداز اور ناقابل تردید دلائل اختیار کر سکتا ہے؟ اور اگر یہ گمان کرے تو کیا اس کا ایمان سلامت رہ جائے گا؟ معاذ اللہ! کیا کوئی مسلمان بقائمیٔ ہوش و حواس یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کا بیان کردہ فلسفہ اور اس کے پیش کردہ دلائل قرآن حکیم کی حکمت اور آیاتِ بیّنات سے زیادہ محکم اور روشن ہیں؟ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ!...... آیاتِ بیّنات تو وہ ہیں جن کے متعلق سورۃ الحدید میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

"وہی (اللہ تبارک و تعالیٰ) تو ہے جو اپنے بندے (محمد رسول اللہ ﷺ) پر روشن اور واضح آیات نازل فرما رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے"۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور قرآن حکیم کا نزول اُس کی شانِ رأفت اور شانِ رحمانیت و رحیمیّت کے مظاہر اتم ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ

الْقُرْاٰنَ ﴿۲﴾ (الرحمٰن)

پس اگر ملک گیر پیمانے پر قرآن مجید کے ترجمے کی مہم شروع ہو جائے تو میرے نزدیک یہ ہے پہلے محاذ کے روگ کا مداوا۔ میں نے اس کو نمبر ایک پر اس لیے رکھا ہے کہ عددی اعتبار سے ہماری ملت اور ہماری قوم کی عظیم ترین اکثریت درحقیقت اسی جاہلیّت قدیمہ کا شکار ہے۔

محاذ دوم

جاہلیّت جدیدہ

جہاد بالقرآن کا دوسرا محاذ جاہلیّت جدیدہ کے خلاف ہے۔ جاہلیّت جدیدہ الحاد و مادہ پرستی کا دوسرا نام ہے۔ اس میں اللہ کا انکار بھی ہے اور بعث بعد الموت کا بھی۔ اس میں مادے (matter) سے ماوراء کسی شے کو تسلیم کرنے سے اعراض اور احتراز ہے۔ اسی جاہلیّتِ جدیدہ کے لیے میں طبیعیاتی عقل پرستی یا Scientific Rationalism کا لفظ بھی استعمال کیا کرتا ہوں۔

جدید دَور کی اس جاہلیّت کی عمر قریباً تین سو برس ہے۔ یورپ کے دو ممالک فرانس اور جرمنی میں دو تحریکیں بیک وقت شروع ہوئی تھیں: ایک تحریک اصلاحِ مذہب (Reformation) اور دوسری تحریک احیاء العلوم (Renaissance)۔ بدقسمتی سے اُس وقت یورپ میں عیسائیت کے نام سے جو مذہب تھا وہ نہایت ظالمانہ و جابرانہ اور انتہائی غیر معقول اور بعید از انصاف نظام کا حامل تھا۔ اس میں ملوکیت (Monarchy) اور پاپائیت (Theocracy) کا گٹھ جوڑ تھا۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں ردّعمل کے طور پر مذہب سے ایک نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ اس پس منظر اور اس فضا میں جب سائنس کی ترقی شروع ہوئی تو سائنس کی جڑوں میں الحاد پیوست ہوگیا اور سائنسی نقطۂ نظر یہ بن گیا کہ جو چیز (verifiable) نہیں ہے، جس کی ہم توثیق یا تردید نہیں کر سکتے، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہونی چاہیے، یہ چیزیں لائق اعتناء نہیں ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ ہم یقین کے ساتھ یہ جان سکیں کہ اللہ موجود ہے یا نہیں ہے، تو اس پر ایمان چہ معنی دارد! اسی طرح ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ ہم کہہ سکیں کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں ہے۔ اس کا ہمارے پاس نہ کوئی سائنسی ثبوت ہے اور نہ کسی نے موت کی سرحد پار کرنے کے بعد پھر واپس آ کر ہمیں خبر دی ہے۔ لہٰذا اس کو چھوڑیئے، یہ خواہ مخواہ کے ڈھکوسلے ہیں۔ کوئی اسے "Dogma" کے طور پر مانتا ہے تو مانتا رہے، لیکن یہ کوئی قابل توجہ مسئلہ نہیں ہے۔ اسی طریقے سے کوئی ثابت نہیں کرسکتا کہ ہمارے جسم میں جو جان (life) ہے، اس کے علاوہ روح نام کی بھی کوئی شے ہے۔ اس کی آج تک کوئی توثیق (verification) نہیں ہوسکی، لہٰذا اس مسئلہ کو چھوڑو۔ معقول طرزِ عمل یہی ہے کہ جو چیزیں موجود ہیں، ٹھوس ہیں، قابل تصدیق ہیں، ہمارے حواسِ خمسہ کے دائرے میں آتی ہیں اُن ہی پر توجہ مرتکز رکھو۔ لہٰذا طبیعیاتی عقل پرستی کا فارمولا یہ بنا کہ چونکہ اللہ ایک خیالی وتصوراتی چیز ہے جب کہ کائنات ایک حقیقت ہے، روح بھی ایک تصوراتی چیز ہے جب کہ مادہ اور جسم ایک ٹھوس حقیقت ہے، اور حیاتِ اُخروی بھی اسی قبیل کی شے ہے جب کہ حیاتِ دُنیوی ایک حقیقت ہے اور اس سے ہر وقت، ہر لمحہ اور ہر لحظہ سابقہ ہے، لہٰذا ماورائے حواس اور خیالی وتصوراتی باتوں پر غور کرنا وقت کا زیاں ہے۔ اس کے بجائے ہماری توجہات کا ارتکاز اُن چیزوں پر ہونا چاہیے جو ٹھوس ہیں، نگاہوں کے سامنے ہیں، حواس کی گرفت میں آنے والی ہیں، قابل توثیق ہیں اور جن سے ہمیں ہر دم واسطہ پڑتا ہے۔ یہ ہے اصل میں اِس دَور کی جاہلیّت، یعنی جاہلیّتِ جدیدہ کا صغریٰ کبریٰ۔

جاہلیّتِ جدیدہ کا ذکر قرآن میں

اس موقع پر میں آپ سے یہ عرض کر دوں کہ یہ نہ سمجھئے کہ یہ بالکل نئی جاہلیّت ہے۔ دبے دبے انداز میں ایک محدود پیمانے پر الحاد و مادہ پرستی پر مشتمل یہ جاہلیّت، جس

کے لیے موزوں ترین لفظ ''دہریت'' استعمال کیا جا سکتا ہے' بعثتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وقت بھی موجود تھی۔ میں حیران ہوں کہ قرآن مجید میں ایک ہی جملہ میں اُس قلیل گروہ کے فلسفہ دہریت کو اس طور سے بیان کر دیا گیا ہے کہ دورِ جدید کی ہر نوع کی جاہلیّت اور دہریت کی طرف بھی اس میں واضح اشارات موجود ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے' جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس میں پچھلے زمانے کی خبریں بھی ہیں اور آنے والے زمانے کی بھی۔ تو قرآن کا یہ ایک جملہ دہریت والحاد کے تمام مکاتیب فکر کی نمائندگی کرتا ہے:

﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾

(الجاثیہ:۲۴) اس مکتبِ فکر کا قول نقل فرمایا گیا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس ہماری یہی دنیا کی زندگی ہے۔ یعنی ہم نہیں مانتے کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ پھر یہ کہ ایسی کوئی بالاتر طاقت یا ہستی نہیں ہے جس کے فیصلے سے ہمارا یہ مرنا اور جینا ہو رہا ہو۔ ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی زندہ ہوتے ہیں...... جبکہ قرآن مجید میں اس کے بالکل برعکس حقیقت بیان ہوتی ہے: ﴿يُحْيِ وَيُمِيْتُ﴾ ''وہ (اللہ) ہی زندہ رکھتا ہے اور وہی موت دیتا ہے''۔ یہ کارگاہِ موت و حیات اُسی کی تخلیق ہے۔ ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ﴾ ''وہی ہے جس نے موت اور زندگی کی تخلیق فرمائی''۔ لیکن یہاں نسبت اپنی طرف ہے: ﴿نَمُوْتُ وَنَحْيَا﴾ ''ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں''۔ ﴿وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ﴾ ''اور ہمیں ہلاک کرنے والی چیز بھی سوائے گردشِ افلاک کے اور کچھ نہیں''۔ ایک نظام رواں دواں ہے۔ کچھ قوانین طبیعیہ (Laws of Nature) ہیں جن کے تحت اس کائنات کا کارخانہ چل رہا ہے۔ لوگ پیدا ہوتے ہیں' جیتے ہیں' مرتے ہیں۔ کسی بالاتر طاقت اور موت کے بعد دوبارہ وجود اور کسی دوسری زندگی کو ہم نہیں مانتے......!

بتائیے کہ اِس دَور کی جدید جاہلیّت اس سے آگے اور کہاں جائے گی؟ بلکہ آج کے دور کے سائنٹفک ذہن رکھنے والے لوگ تو پھر بھی محتاط الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ باتیں حقیقت رکھتی ہیں یا نہیں! ہم کوئی حتمی حکم نہیں لگا سکتے کہ اللہ ہے یا نہیں! آخرت ہے یا نہیں! اس طرح سے وہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل اس دَور کے عظیم ترین اور نہایت مسلّمہ فلسفیوں میں سے تھا اور اس نے الحاد و مادیت اور دہریت کے فلسفے کا پرچار اور اللہ' آخرت' روح اور اخلاق کا ابطال جس بڑے پیمانے پر اور جس مقبولِ عام اور دلنشین اسلوب و انداز سے کیا ہے' اس کا صحیح اندازہ ہم کو نہیں ہے۔ اس نے ہماری نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اکثریت کے اذہان کو مغلوب کر رکھا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی سورۃ الجاثیہ کی ایک آیت کے ابتدائی حصے کے حوالے سے بیان کیا ہے' اس نوع کی جاہلیّت کے جراثیم اگرچہ وہاں بھی موجود تھے' لیکن اُس دور میں ایسے مسخ شدہ ذہنیت والے دانشور آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ وہاں جو غالب جاہلیّت تھی اسے میں جاہلیّت قدیمہ کے ضمن میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی اللہ کو ماننے کے ساتھ جھوٹے معبودوں کا اقرار اور اُن کی پوجا پاٹ' اور آخرت کو ماننے کے ساتھ شفاعتِ باطلہ کا تصور وعقیدہ۔ جس پر قرآن میں نہایت واضح اور نمایاں انداز میں بحث کر کے اُس کا پوری طرح سے ابطال کیا گیا ہے۔ البتہ جاہلیّتِ جدیدہ کا معاملہ چونکہ وہاں بہت کم تھا لہٰذا اس پر قرآن مجید میں بحث اس انداز میں نہیں ہے جس طرح جاہلیّت قدیمہ کے ضمن میں کی گئی ہے۔ لیکن اس معاملے میں بھی قرآن حکیم بھرپور رہنمائی فراہم کرتا ہے اور یہ رہنمائی اُن باصلاحیت' باہمت اور ذہین لوگوں کے لیے ہے جو کمر کس لیں اور پھر قرآن حکیم کی آیاتِ بیّنات میں غوطہ زنی کریں اور جدید اسلوب و انداز کے ساتھ اس کا ابلاغ و اعلام کریں۔ اس لیے کہ زمانہ اور اس کے تقاضے بدل گئے ہیں' جن اصطلاحات میں لوگ بات سمجھتے ہیں وہ اصطلاحات بدل گئی ہیں۔ اگر آپ بہترین اور مسکت بات کہیں گے لیکن قدیم اصطلاحات میں کہیں گے تو یہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کے لیے استدلال آپ کو جدید اصطلاحات میں

ڈھال کر پیش کرنا ہوگا۔ پھر یہ کہ اس جاہلیّت جدیدہ کے لیے اس دَور میں جو عقلی مواد فراہم کیا گیا ہے' اس کے ابطال کے لیے آپ کو عقلی دلائل لانے ہوں گے۔ اگرچہ ان تمام کاموں کے لیے اصل تلوار قرآن ہی کی استعمال ہوگی' لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اس میدان میں سخت محنت کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لیے قرآن حکیم میں غوطہ زنی کرنی ہوگی جس کے لیے کچھ نوجوانوں کو اپنی پوری پوری زندگیاں وقف کرنی ہوں گی۔

جاہلیّتِ جدیدہ کے لامحدود گوشے

جاہلیّتِ قدیمہ کے برعکس جاہلیّت جدیدہ کئی گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ بے خدا سائنس اور فکر و فلسفہ کی جولانگاہیں لامحدود ہیں۔ اس دور میں علم الحیاتیات اور علم الحیوانات کی طرح کی "Physical Sciences" بھی ہیں' پھر "Social Sciences" بھی ہیں' جن کا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ اور یہ بات جان لیجیے کہ ڈارون کا فلسفۂ ارتقاء اب صرف حیاتیات کے میدان تک محدود نہیں رہا ہے' اس نے انسان کی معاشرتی اقدار اور تمدنی و تہذیبی فکر' حتیٰ کہ فلسفۂ اخلاقیات تک کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ اور یہ فلسفہ انسان کو محض ایک ترقی یافتہ حیوان کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اس فلسفہ نے حیوانی شہوات و داعیات کی تسکین کے لیے انسان کو حیوانات کی طرح کھلا لائسنس دے دیا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس زہر کا تریاق فراہم کرنا ہوگا۔ پھر ماہرین نفسیات نے نفسیات (Psychology) کے میدان میں جو گُل کھلائے ہیں اور جس طرح کی گمراہیاں پھیلائی ہیں' ان سب کا ابطال کرنا ہوگا۔ اس میدان میں سب سے بڑی گمراہی فرائیڈ کی پیدا کردہ ہے جس نے انسان کے تمام محرکاتِ عمل کو جنسی جذبے کے تابع قرار دے دیا ہے۔ اسی طرح عمرانیات (Socialogy) کے میدان میں جو بھی باطل اور گمراہ کن نظریات در آئے ہیں' ان سب کا توڑ کرنا ہوگا۔

مارکسزم (Marxism) اِس دَور کا سب سے مقبول فکر ہے جس کا صرف اذہان ہی پر نہیں' بلکہ دنیا کے قابل ذکر ممالک پر عملاً اس نظامِ فکر کا استیلاء و تسلط ہے۔ مارکسزم اور کمیونزم کے متعلق یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ مادیت ہی کا نقطۂ عروج ہے۔ مادیت (Materialism) ہی اپنی انتہا کو پہنچ کر جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اور جیسے ڈارون کے نظریے نے اخلاقیات' معاشرت اور عمرانیات میں نفوذ کر رکھا ہے' اسی طرح مارکسزم کے نظریے نے انسان کی اخلاقی قدروں اور انسانی تہذیب کے تصورات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس نے دین و مذہب کے عقائد کی بنیادیں ڈھا کر رکھ دی ہیں اور اپنے ماننے والوں کو مکمل طور پر دہریہ و ملحد بنا کر رکھ دیا ہے۔ انسان کے ماورائی عقائد اور اخلاقی قدریں اس فکر و نظریہ کے تحت آ کر بالکل نیا رُخ اختیار کر گئی ہیں۔

الغرض اس تیسرے محاذ یعنی جاہلیّت جدیدہ کی کوکھ سے بہت سے فتنے جنم لے چکے ہیں۔ ان سب کے خلاف محاذ آرائی کرنی ہوگی۔ اس جاہلیّتِ جدیدہ کے ابطال کے لیے خود اِس کے اندر بہت سے محاذ کھولنے ہوں گے۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک کے مقابلے کے لیے ضرورت ہے کہ چند باصلاحیت نوجوان اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ باہمت' محنتی اور کام میں غرق ہو جانے والے ہوں۔ ایسے نوجوانوں کے لیے نبی اکرم ﷺ کی بشارت ہے: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) ''تم میں سے بہترین انسان وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں''۔ قرآن حکیم کے معارف و حکم سے خود بھی بہرہ مند ہوں اور خلق خدا کو بھی مستفید کریں۔

جاہلیّتِ قدیمہ کا ابطال' جیسا کہ میں نے عرض کیا' محض ترجمۂ قرآن سے بھی ہو جائے گا' لیکن اس جاہلیّت جدیدہ کے ابطال اور اس کی بیخ کنی کے لیے قرآن حکیم میں غور و تدبر کرنا ہوگا اور اس کے معانی و مفاہیم کے جواہر کی یافت کے لیے قرآن کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زنی کرنی ہوگی۔

ایک طویل حدیث میں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' قرآن حکیم کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَآءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ))

''علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہو سکیں گے' نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس

کے لطف وتاثیر میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے
علوم ومعارف) کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا''۔

قرآن مجید کی یہ تین شانیں جو نبی اکرم ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمائی ہیں'
ان میں سے آخری شان میری اس گفتگو سے بہت زیادہ متعلق ہے۔ ایک ہیرے کی
کان کا تصور کیجیے' جس میں کارکن لگے ہوئے ہیں اور ہیرے برآمد کر رہے ہیں۔ لیکن
ایک وقت ایسا آ کر رہتا ہے کہ کان خالی ہو جاتی ہے اور ہیرے دستیاب نہیں ہوتے۔
لیکن قرآن ایسی معدن' ایسی کان نہیں ہے کہ جس کے متعلق کبھی یہ کہا جا سکے کہ حکمت
کے موتی اب اس میں سے مزید نہیں نکل سکتے۔ قرآن تو اُس اتھاہ سمندر کے مانند ہے
کہ انسان اس کی جتنی گہرائیوں میں جائے گا اتنے ہی اعلیٰ دُرِّ شہوار نکال کر لائے گا اور
یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیش جاری وساری رہے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ قرآن کی حکمت کے سمندر
میں غوطہ زنی ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس بحر کی گہرائیوں سے حِکم و
معارف کے موتی نکال لانے کے لیے جان گُسل کوشش اور پِتّا مار کر محنت کرنا ہوگی۔ لہٰذا
ذہین وباصلاحیت اور دولتِ ایمانی کے حامل حضرات کو اس بحرِ زخّار کی غواصی سے ہر
دَور کے تمام باطل نظریات اور خدا ناآشنا افکار کے ابطال کے لیے نہایت محکم دلائل
اور قاطع براہین ملتے رہیں گے' جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((وَلَا تَنْقَضِیْ
عَجَائِبُہٗ)) پس اس دوسرے محاذ پر یعنی جاہلیّت جدیدہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھی
ہمیں قرآن کی شمشیر برّاں ہاتھ میں لے کر مورچہ لگانا ہوگا۔

محاذِ سوم

بے یقینی

ہمارے معاشرے میں معتدبہ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو بحمد اللہ شعوری سطح پر
جاہلیّت قدیمہ اور جدیدہ دونوں سے بچے ہوئے ہیں' لیکن ان کی بیماری ایک تیسری
نوع کی بیماری ہے اور وہ ہے بے یقینی کی بیماری۔ یعنی مثبت طور پر جو یقین ہونا چاہیے
انہیں وہ میسر نہیں ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ محض منفی چیزوں سے اگر آپ نے خود کو
بچا بھی لیا تو اس سے آپ کے اخلاق وکردار پر اور آپ کی زندگی کے رُخ پر کوئی
فیصلہ کن اثر مترتب نہیں ہو سکتا جب تک کہ مثبت طور پر یقین نہ ہو۔ سورۃ الحجرات کی
آیت ۱۴ کے درس کے ضمن میں مَیں نفاق اور ایمان کے بارے میں یہ عرض کیا کرتا
ہوں کہ ان دونوں کو یوں سمجھئے کہ نفاق ایک منفی قدر (minus value) ہے اور
ایمان ایک مثبت قدر (plus value) ہے۔ پھر اس مثبت قدر میں درجہ بدرجہ
اضافہ ہوتا ہے۔ ایک میرا اور آپ کا ایمان ہے' ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' عشرہ مبشرہ
اور بالخصوص انبیاء ورُسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ایمان ہے۔ تو یوں سمجھ لیجیے کہ یہ معاملہ
لامحدود درجے (plus infinity) تک چلتا جائے گا۔ اسی طرح نفاق کا معاملہ
ہے۔ اس کا ایک نقطۂ آغاز بھی ہے اور اس کا تیسرا درجہ بھی ہے' جہاں پہنچ کر یہ ٹی بی
کے مرض کی طرح لاعلاج ہو جاتا ہے۔ نفاق اور ایمان کے مابین ایک اور مقام ہے
جسے میں ''zero level'' سے تعبیر کرتا ہوں۔ میں نے جس تیسرے طبقے کا ذکر کیا
ہے' بدقسمتی سے اس کی اکثریت اسی سطح پر کھڑی ہے۔ یعنی کوئی منفی چیز بھی نہیں ہے' نہ
جاہلیّت قدیمہ ہے نہ جاہلیّتِ جدیدہ — کم از کم شعوری سطح پر نہیں ہے — لیکن مثبت طور پر
یقینِ محکم والا ایمان بھی نہیں ہے اور اس کی طرف کوئی پیش قدمی بھی نہیں ہو رہی۔ تو
ضرورت اسی یقینِ محکم اور ایمانِ کامل والے ایمان کی ہے' جیسے کہ علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

ایمان جب یقین کی شکل اختیار کرے گا جب ہی تو اس میں ایک قوت پیدا
ہوگی! جب ہی وہ شخصیت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالے گا اور پوری شخصیت کی کایا
پلٹ دے گا!

سورۃ الحجرات ہی کی آیت ۷ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب فرماتے ہوئے

ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک بہت محبوب کر دیا ہے اور اس کو تمہارے دلوں کے اندر مزین کر دیا ہے''۔ نورِ ایمان نے تمہارے دلوں کو منور کر دیا ہے۔ یہ ایمان اللہ کے فضل و کرم سے تمہارے دلوں میں راسخ اور جاگزیں ہو گیا ہے۔ جب تک یہ کیفیت نہ ہو' ایمان کے اثرات انسان کے سیرت و کردار' معاملات اور عملی رویے پر مترتب نہیں ہوں گے۔ اب اس بے یقینی کا علاج کہاں سے لایا جائے؟ اس کا دارو کہاں ملتا ہے؟

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اسی قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات ہی سے اس بے یقینی کا علاج ہوگا۔ بقول مولانا ظفر علی خان مرحوم: ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئے دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

یقین والے ایمان کا اصل ذریعہ (source) قرآن ہے۔ اگرچہ اس کا ایک ذریعہ اور بھی ہے' لیکن وہ ثانوی ہے۔ صاحبِ یقین کی صحبت سے بھی یقین والا ایمان پیدا ہوتا ہے ع ''صحبت صالح ترا صالح کند''۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صاحبِ یقین کے قرب کی مثال ایسے ہے جیسے آگ کی ایک بھٹی دہک رہی ہو' آپ اس کے قریب جائیں گے تو حرارت آپ کو پہنچ کر رہے گی۔ یہ قانونِ طبعی ہے۔ برف کی سل کے پاس بیٹھیں گے تو برودت تو آپ سے آپ پہنچے گی۔ تو اگر کسی کے دل میں یقین والے ایمان کی شمع روشن ہے تو آپ اگر اُس کے قریب رہیں گے' اس کی صحبت سے فیض اٹھائیں گے تو آپ کو بھی یقین کی دولت ملے گی۔ لیکن میں اس کو ثانوی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمیں پہلے یہ طے کرنا پڑے گا کہ وہ صاحبِ یقین کہاں سے آئے گا! تو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ ایسے صاحبِ یقین پیدا کرنے کا واحد ذریعہ بھی قرآن حکیم ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت میں یہ دوں گا کہ دنیا کے سب سے عظیم صاحبِ یقین' جن سے بڑا کوئی صاحبِ یقین ہو ہی نہیں سکتا' خاتم النبیین' سید المرسلین حضرت محمد ﷺ ہیں۔ قرآن مجید میں سورۃ الشوریٰ کی آخری سے پہلی آیت یعنی آیت ۵۲ میں نبی اکرم ﷺ کے ایمان و یقین کا تجزیہ کر کے بتا دیا گیا کہ حضور ﷺ کو ایمان و یقین کہاں سے ملا! ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥٢﴾﴾

''اور (اے نبیؐ!) اسی طرح ہم نے اپنے امر سے ایک روح (یعنی یہ قرآن مجید) آپؐ کی طرف وحی کیا ہے' (اس سے پہلے) آپؐ کو معلوم نہ تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے! لیکن ہم نے اس (قرآن) کو نور بنا دیا جس کے ذریعہ سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اور (اب جبکہ آپ ﷺ حاملِ قرآن بن گئے تو) آپؐ یقیناً نوعِ انسانی کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیں گے''۔

نورِ وحی سے قبل حضور ﷺ کے ایمان کی ماہیت:

یہاں مجھے تھوڑی سی وضاحت کرنی ہوگی' مبادا مغالطہ ہو جائے۔ یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضور ﷺ وحی کے نزول سے قبل مؤمن نہیں تھے؟ اسی نوع کی ایک بحث ہمارے یہاں حضور ﷺ کے آباء و اجداد کے بارے میں بھی چلتی ہے کہ کیا جناب عبداللہ' جناب عبدالمطلب' جناب آمنہ کو ہم کافر یا مشرک کہیں گے؟ یہ بحثیں عوامی سطح پر ہوتی ہیں اور اس میں بڑی جذباتیت آ جاتی ہے۔ تو جان لیجیے کہ قرآن مجید ہمیں سورۃ النور کی آیاتِ نور کے ذریعے یہ بتاتا ہے کہ نورِ ایمان کے دو اجزائے ترکیبی ہیں' ایک نورِ فطرت اور ایک نورِ وحی۔ نورِ فطرت کی مثال صاف شفاف روغن کی ہے جو گویا بھڑکنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے چاہے دیا سلائی ابھی اس کے قریب نہ آئی ہو' جیسے پٹرول۔ تو درحقیقت انسان کی فطرت میں ایمان کا نور بالقوہ (potentially)

موجود ہوتا ہے' البتہ اس پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کے وہ پردے اتنے دبیز اور بھاری ہوتے ہیں کہ اٹھائے نہیں اٹھتے۔ نورِ وحی بھی آ کر اُن لوگوں کے ان پردوں کو چیر کر دل کے اندر موجود نورِ فطرت کے روغن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ایسے لوگ نورِ ایمان سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس وہ شخص جس کے قلب پر کوئی حجاب نہیں' یعنی سلیم الفطرت اور سلیم القلب انسان' (جیسا کہ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ﴾ (الصّٰفّٰت) تو اس کے پاس جیسے ہی نورِ وحی آتا ہے تو یوں سمجھئے جیسے کہ آئینے کے سامنے روشنی آ گئی۔ لہٰذا نورِ وحی سے اس کا آئینہ قلب جگمگا اٹھتا ہے۔ تو یہ ہے مثال نورِ فطرت اور نورِ وحی کی۔ اسی کو سورۃ النور میں نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہم یوں کہیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کے قلبِ مبارک میں ایمان بالقوہ یا dormant form میں تو موجود تھا' لیکن اس کو تحریک وحی سے ملی' وحی نے اسے متحرک کیا' اسے actualise کیا۔ یہ ہے مفہوم ان الفاظِ مبارکہ کا: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾

سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات جن کے متعلق صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ یہ آیات حضور ﷺ کو شبِ معراج میں اُمت کے لیے بطور تحفۂ خاص عطا ہوئی تھیں' ان میں سے پہلی آیت میں قرآن حکیم پر پہلے خود نبی اکرم ﷺ کے ایمان لانے کا ذکر ہے اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان لانے کا: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾

دلکش ترین ایمان کس کا ہے؟

اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی ایک بڑی پیاری حدیث مشکوٰۃ شریف کے آخری باب: **بابُ ثوابِ ھٰذہِ الاُمّۃ** میں امام بیہقیؒ کی ''دلائل النبوۃ'' کے حوالے سے آئی ہے۔ اس حدیث کو حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں۔ چشم تصور سے دیکھئے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجلس میں رونق افروز ہیں۔ آپ ؐ صحابہؓ سے سوال کرتے ہیں: ((اَیُّ الْخَلْقِ اَعْجَبُ اِلَیْكُمْ اِیْمَانًا)) ''مجھے بتاؤ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟'' 'اعجب' عجیب سے اسم تفضیل ہے۔ اردو میں عجیب کا لفظ حیران کن یا غیر معمولی بات کے لیے مستعمل ہے' لیکن عربی میں عجیب دل کو لبھانے والی شے کو کہتے ہیں' یعنی دلکش اور دل خوش کن چیز۔ سورۃ الاحزاب میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فرمایا گیا: ﴿وَلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ﴾ ''اور چاہے ان کا حسن آپ ؐ کے دل کو کتنا ہی لبھانے والا کیوں نہ ہو''۔ سورۃ المنافقون میں ارشاد ہوا: ﴿وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ﴾ ''اور جس وقت آپ ؐ ان کو دیکھتے ہیں تو اُن کے بدن آپ کو خوش لگتے ہیں''۔ تو حضور ﷺ نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا کہ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ دلکش' دل کو لبھانے والا اور حسین ایمان کس کا ہے؟ یہ بھی حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت کا ایک انداز ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: ''فرشتوں کا''۔ حضور ﷺ نے اس کو ردّ فرمادیا: ((وَمَا لَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ)) ''وہ ایمان کیسے نہیں لائیں گے جبکہ وہ اپنے ربّ تعالیٰ کے پاس ہیں!'') ان کے لیے تو غیب کا پردہ حائل نہیں ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں تو اس میں کون سا کمال ہے؟ پھر صحابہؓ نے عرض کیا: فَالنَّبِیُّوْنَ ''پھر نبیوں کا ایمان ہے!''

حضور ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا لَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَالْوَحْیُ یَنْزِلُ عَلَیْهِمْ)) ''وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے جبکہ اُن پر وحی نازل ہوتی ہے!'' انبیاء f پر اللہ کا فرشتہ وحی لے کر نازل ہوتا ہے' انہیں غیب کی خبروں سے مطلع کرتا ہے' پھر اللہ ان کو اپنی نشانیوں میں سے کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کراتا ہے۔ لہٰذا وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے اور ان کا ایمان ''اعجب'' کیسے ہوگا! تیسری بار صحابہ کرامؓ نے بڑی ہمت و جرأت کر کے اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا: ''فَنَحْنُ'' ''پھر ہم ہیں''۔ ہمارا ایمان اعجب ہے۔ حضور ﷺ نے اس کو بھی ردّ فرمادیا: ((وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ وَاَنَا بَیْنَ اَظْهُرِكُمْ)) ''تم کیسے ایمان نہ لاتے جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں''۔ یعنی اللہ کی سب سے بڑی نشانی اور

اس کا سب سے بڑا معجزہ تمہارے سامنے ہے۔ تم کو میرے دیدار اور میری صحبت کا فیض حاصل ہے۔ میری ذات سے جن برکات کا ظہور اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا جو نزول ہو رہا ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ انتہائی قلیل تعداد اور بے سروسامان ہونے کے باوجود اللہ کی نصرت وتائید سے تمہیں مشرکین وکفار پر جو فتوحات حاصل ہو رہی ہیں' ان کا تم اپنی چشم سر سے ہر لحہ مشاہدہ کرتے ہو۔ میں نے بنفسِ نفیس تمہیں توحید کی دعوت پہنچائی ہے' تم پر قرآن مجید کی تبلیغ اور اس کے معارف وحکم کی تبیین کی ہے' تو تم کیسے ایمان نہ لاتے! اب حضور ﷺ خود جواب ارشاد فرماتے ہیں: ((اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَیَّ اِیْمَانًا لَقَوْمٌ یَکُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ)) : ''میرے نزدیک تو سب سے زیادہ دلربا' دلکش اور حسین ایمان اُن لوگوں کا ہوگا جو میرے بعد ہوں گے'' ((یَجِدُوْنَ صُحُفًا فِیْهَا کِتَابٌ)) ''ان کو تو اوراق ملیں گے جن میں ایک کتاب (قرآن مجید) درج ہوگی''۔ ((یُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِیْهَا)) ''وہ اس پر ایمان لائیں گے جو کچھ اُن اوراق میں ہوگا''۔ یعنی وہ نہ میرے دیدار سے شادکام ہوئے' نہ انہوں نے میری صحبت سے فیض اٹھایا' نہ انہوں نے ان برکات' معجزات' نزولِ رحمت اور نصرتِ الٰہی کا بچشم سر مشاہدہ کیا' لیکن وہ اس قرآن پر ایمان لانے کے ذریعے سے ان تمام حقائقِ کونیہ وتشریعیہ پر ایمان لائیں گے جو میں لے کر آیا ہوں۔

اس مقام پر ایک اہم بات کی وضاحت ضروری ہے۔ یہاں افضلیت کی بات نہیں ہو رہی۔ انبیاء کے بعد افضل ترین ایمان لاریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کا ہے۔ یہاں حسین ودلکش ایمان کی بات ہو رہی ہے' ان کے ایمان کی جنہوں نے نہ اللہ کی سب سے عظیم نشانی یعنی نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کا دیدار کیا اور نہ دنیا کے عظیم ترین مربی ومزکی کی صحبت سے مستفیض ہوئے' لیکن انہوں نے نورِ ایمان قرآن مجید سے حاصل کیا جو درحقیقت منبع وسرچشمۂ ایمان ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نور قرار دے رہا ہے: ﴿جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ﴾ تو ایک سند قرآن مجید سے اور ایک سند حدیث شریف سے کافی ہے۔ معلوم ہوا کہ بے یقینی کے اس روگ کا واحد علاج قرآن حکیم ہی ہے۔ یہی بے یقینی کو ختم کرنے والی واحد تلوار ہے۔ چنانچہ ''بے یقینی'' کے خلاف بھی ''جہاد بالقرآن'' کرنا ہوگا۔ اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں!

محاذِ چہارم:

نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات

اس دَور میں نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات کا محاذ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں عام لوگوں کی نفس پرستی اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ اس کا سبب تو وہی ہے جس پر جاہلیتِ قدیمہ' جاہلیتِ جدیدہ اور بے یقینی کے محاذوں کے ضمن میں گفتگو کے دوران اشارات ہو چکے ہیں' اور پھر اس نفس پرستی کا تعلق زیادہ تر افراد کی اپنی ذاتی زندگی سے ہے' لیکن ہمارے یہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے اسے باقاعدہ ایک منظم ادارے (institution) کی شکل دے رکھی ہے اور کلچر اور ثقافت کے نام پر منکرات وفواحش کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ایک مسلمان کے دل میں اباحیت اور منکرات سے جو بُعد اور نفور ہوتا تھا اور حرام چیزوں کے خلاف دل میں جو جذبۂ نفرت ہوتا تھا اسے ثقافتی طائفوں' ریڈیو اور ٹی وی ڈراموں' راگ ورنگ کی محفلوں اور تعلیمی' کاروباری' دفتری اور صنعتی اداروں میں مرد وزن کے مخلوط طریقِ کار کے ذریعے ختم کر دیا گیا ہے۔ اور اس سارے نظام کو ایک طرف اباحیت پسند طبقے اور دوسری طرف خود سرکاری سطح پر سرپرستی حاصل ہے۔ اس کو تہذیب' ثقافت' فنونِ لطیفہ اور مرد وزن کی مساوات کے خوشنما نام دیے گئے ہیں۔ اب بے پردگی' نیم عریانی' خواتین کی رنگین ومزین تصاویر کو تہذیب وتمدن کی ناگزیر ضرورت قرار دیا گیا ہے اور اس طرح عورت کو چراغِ خانہ سے شمعِ محفل اور اس سے بڑھ کر اشتہاری جنس بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ہمارے اخبارات ورسائل (الا ماشاء اللہ) اور دوسرے ذرائع ابلاغ اس

میں مسابقت کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں، اس کو وقت اور زمانے کا تقاضا سمجھ لیا گیا ہے۔ دین تو رہا ایک طرف، ہماری جو معاشرتی، تہذیبی اور مجلسی اقدار تھیں، ان سب کو بھی پائمال کیا جارہا ہے۔

جو لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں وہ اگرچہ اقلیت پر مشتمل ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کا ذرائع ابلاغ پر پوری طرح غلبہ اور تسلط ہے۔ اس اقلیتی گروہ نے کچھ وقتی تقاضوں اور کچھ لوگوں کے دینی رجحان کے پیش نظر ان ذرائع ابلاغ کا کچھ حصہ اسلامی اور دینی پروگراموں کے لیے بھی مخصوص کر رکھا ہے جو اکثر و بیشتر محض بہلاوے اور دکھاوے کے لیے ہوتے ہیں، اور بڑی چابک دستی، ہوشیاری اور احتیاط یہ برتی جاتی ہے کہ کہیں کوئی ایسا کام نہ ہو جائے کہ ان ذرائع ابلاغ سے عوام الناس تک دین کا حقیقی پیغام پہنچ جائے۔ مبادا اعجازِ قرآنی لوگوں کے اذہان وقلوب میں نفوذ کر کے ان کو مسخر کر لے۔ یہ وہی خوف ہے جس کا اظہار علامہ اقبال مرحوم نے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ابلیس کی زبان سے اس طرح کرایا ہے ؎

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

لہٰذا سرکاری ذرائع ابلاغ میں دین و مذہب کے نام سے جو پروگرام رکھے جاتے ہیں یا اخبارات و رسائل میں جو صفحات مختص کیے جاتے ہیں ان میں بظاہر احوال کوشش یہ ہوتی ہے کہ غیر محسوس طریقے سے انتشار (confusion) کو ہوا دی جائے۔ چنانچہ کوئی مشرق کی بات کہتا ہے تو کوئی مغرب کی بات لکھتا ہے۔ کوئی شمال کی بات کہے گا تو اگلا جنوب کی بات کرے گا، تاکہ دین و مذہب کے بارے میں نفسیاتی الجھاؤ اور ذہنی انتشار بڑھتا چلا جائے۔ پھر بالفرض کوئی مؤثر بات آ ہی جائے تو فوری طور پر اس کے متصلاً بعد کچھ ایسے پروگرام رکھ دیے جائیں گے جن کے ذریعے یہ اثرات زائل ہو جائیں، ذہن سے محو ہو جائیں، یعنی ع

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب

پھر ان تمام ذرائع ابلاغ و وسائلِ ابلاغ کے کرتا دھرتا اُن خواتین کے بیانات، مضامین، انٹرویوز، تصاویر اور خبروں کو انتہائی نمایاں کرتے ہیں جو مغرب زدہ اور اباحیت پسند ہیں اور ہمارے ملک میں انتہائی اقلیت میں ہیں۔ لیکن تأثر یہ دیا جاتا ہے کہ گویا ہمارے ملک کی خواتین کی اکثریت اسی طرزِ فکر کی حامل خواتین کی ہے جن کے نزدیک دین و مذہب اور ہماری تہذیب و معاشرتی اقدار پرکاہ کے برابر بھی وقعت اور حیثیت نہیں رکھتیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی عظیم اکثریت ان دین پسند خواتین پر مشتمل ہے جن کے نظریات ان مغرب زدہ خواتین کے نظریات کے بالکل برعکس ہیں۔ لیکن معاملہ چونکہ یہ ہے کہ ع ''ولیکن قلم در کفِ دشمن است'' لہٰذا خواتین کے اس قلیل ترین طبقے کو وسائلِ ابلاغ کے ذریعے اس طرح project اور نمایاں کیا جاتا ہے گویا پاکستان میں بسنے والی تمام خواتین اسی نظریہ وخیال کی حامی ہیں۔ یہ ہے اس جہاد کا چوتھا محاذ۔ اب سوال یہ ہے کہ اس محاذ پر ہم کیا کر سکتے ہیں!

کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

ان ذرائع ابلاغ سے معاشرے میں نفس پرستی کا جو نفوذ ہو رہا ہے اور انسان کی سوچ اور رجحانات و میلانات کو جس طرح غلط رُخ پر ڈالا جارہا ہے اس سے مقابلے کے لیے بھی ہمارے پاس ڈھال اور تلوار قرآن ہی ہے۔ میں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے اس عزم کو بہت عام کیا ہے جس کا حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۲۰ء میں اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں علماء کے ایک اجتماع میں اظہار کیا تھا:

''میں وہیں (مراد ہے اسارتِ مالٹا) سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کر دوں کہ قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے......''

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے علمائے حقانی وربانی جو اپنا تعلق امام الہند

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہما اللہ سے قائم کرنے کو اپنے لیے موجب اعزاز وافتخار سمجھتے ہیں‘ وہ فقہی وکلامی تعبیر اور استنباط کی بحثوں سے صرفِ نظر کر کے ایک منظّم تحریک کی شکل میں حضرت شیخ الہندؒ کے عزم کو عملی شکل دینے کے لیے کمر ہمت کس لیں۔ شہر شہر‘ محلّہ محلّہ‘ کوچہ کوچہ‘ قریہ قریہ عوامی درسِ قرآن کے حلقے قائم کریں اور قرآن مجید‘ فرقانِ حمید کی شمشیر برّاں کے ذریعے نفس پرستی اور اباحیت پسندی کے خلاف جہاد کریں اور اس سیلاب کے آگے سدِّ ذوالقرنین بن جائیں۔ یہی پیغام اس مردِ قلندر نے آج سے قریباً نصف صدی قبل دیا تھا جس کو بجا طور پر حکیم الاُمت کہا جاتا ہے‘ یعنی ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم ومغفور۔ ان کا پیغام تھا ؎

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم تاکجا در حجرہ ہا باشی مقیم!
در جہاں اسرارِ دیں رافاش کن نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن!

”اے وہ شخص جسے حاملِ قرآن عظیم ہونے پر فخر ہے‘ آخر کب تک حجروں اور گوشوں میں دبکے رہو گے؟ اٹھو اور دنیا میں دینِ حق کے اسرار ورموز اور عرفان وفیضان کو عام کرو اور شریعت اسلامی کے حکم وعبر کی نشر واشاعت کے لیے سرگرم عمل ہو جاؤ!“

یہ ہے علامہ مرحوم کا پیغام حاملِ قرآن اُمت اور بالخصوص علمائے حق کے لیے۔ بفضلہٖ تعالیٰ ملک کا کوئی قابلِ ذکر شہر ایسا نہیں ہے جس میں غالب اکثریت ایسے علمائے کرام کی نہ ہو جن کا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ یا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین جیسے اکابر سے ارادت وعقیدت کا تعلق نہ ہو۔ آخر الذکر بھی درحقیقت ولی اللّٰہی اور دیوبند کے مکتبِ فکر سے وابستہ رہے ہیں اور تھانوی مکتبِ فکر ہو یا ندوی‘ یہ سب ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں۔ اسی طرح مسلکِ سلفی کا تعلق تو براہِ راست حضرت شاہ اسماعیلؒ جیسے غازی ومجاہد اور شہید اور امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے قائم ہے۔ اگر ہمارے یہ علماءِ عظام منظّم ہو کر عوامی درسِ قرآن کی تحریک برپا کر دیں تو اِن شاء اللہ العزیز نفس پرستی‘ اباحیت پسندی اور خدا ناآشنا ثقافت وفنونِ لطیفہ کے نام سے جو زہر ہمارے معاشرے میں پھیلایا جا رہا ہے اس کا سدّ باب بھی ہو جائے گا اور جیسے جیسے قرآن حکیم اُمت کے اذہان وقلوب میں نفوذ اور سرایت کرے گا تو نتیجتاً ذرائع ابلاغ پر قابض اباحیت پسند قلیل طبقہ یا تو اپنا رویہ تبدیل کرنے پر یا اسلام کے سچے خادموں کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ البتہ اس کے لیے ناگزیر شرط یہ ہے کہ تمام انواع کے فقہی وکلامی اختلافات و تأویلات سے دامن بچایا جائے اور قرآن حکیم کا انقلابی پیغام عامۃ الناس تک پہنچایا جائے۔ اگر اس احتیاط کو ملحوظ نہ رکھا گیا تو ابلیس کا وہ مشورہ کارگر ہوگا جو اُس نے اپنی شوریٰ میں بقول علامہ اقبال پیش کیا تھا کہ ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے یہ کتاب اللہ کی تأویلات میں اُلجھا رہے

ذہن وفکر کی تطہیر اور سیرت وکردار کی تعمیر کی اساس اور نفس پرستی کے سیلاب کے آگے کوئی چیز اگر سدّ اور بند بن سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف قرآن مجید ہے۔ اباحیت ونفس پرستی کے قلع قمع کے لیے اگر ہمارے ہاتھ میں کوئی تیغ بے زنہار ہے تو وہ قرآن مجید ہے۔ علامہ اقبال کے یہ اشعار میں نے بارہا آپ کو سنائے ہیں۔ انہیں پھر پیش کر رہا ہوں۔ یہ اشعار میرے مفہوم ومطلوب کو آپ کے اذہان وقلوب میں منتقل اور جاگزیں کرنے میں بہت ممد ومعاون ہوں گے ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی کشتۂ شمشیر قرآنش کنی!

”ابلیس کو ہلاک کر دینا ایک نہایت مشکل کام ہے‘ اس لیے کہ اس کا بسیرا نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں ہے۔ بہتر صورت یہ ہے کہ اسے قرآنِ حکیم کی حکمت وہدایت کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنا لیا جائے“۔

واقعہ یہ ہے کہ آج ہماری ملی وقومی زندگی کے شعور کی گہرائیوں میں آرٹ کونسلز‘ ثقافتی طائفوں کے مبادلوں‘ راگ ورنگ کی محفلوں‘ رومانی ڈراموں‘ افسانوں اور لٹریچر اور ٹیلی ویژن کے مختلف "Cultural Shows" نے ڈیرا لگا رکھا ہے۔ ہمارے

ملک کی اعلیٰ ترین شخصیتیں اس میٹھے زہر کی سرپرستی کر رہی ہیں۔ ان سے نبرد آزما ہونا آسان کام نہیں ہے۔ بہتر شکل یہی ہے کہ قرآن کی تلوار سے ان اربابِ اختیار کو مسلمان بنانے کی کوشش کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ نفسانیت اور شہوانیت تو ہمارے نفس کے اندر ہی ہیں۔ شیطان ان نفسانی خواہشات و داعیات کو بھڑکاتا ہے، انہیں مشتعل کرتا ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرتا۔ چنانچہ آخرت میں جب فیصلے چکا دیے جائیں گے تو جو لوگ دنیا میں شیطان کے دجل و فریب کا شکار ہوئے تھے وہ اس کو ملامت کریں گے۔ شیطان اس کا جو طویل جواب دے گا اُسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ ابراہیم میں نقل فرمایا ہے۔ اس جواب میں وہ کہے گا:

﴿وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ﴾ (آیت ۲۲)

''میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ تمہیں اپنے راستے کی طرف بلایا (اسے خوش نما، دلفریب اور تمہارے نفس کے لیے لذت آفریں بنا کر پیش کیا) تو تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ پس اب مجھے ملامت نہ کرو، بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری کوئی فریاد رسی کر سکتا (اور تمہارے کام آ سکتا) ہوں اور نہ ہی تم میری فریاد رسی کر سکتے (اور میرے کام آ سکتے) ہو۔''

معلوم ہوا کہ شیطان اپنے راستے کو بہت مزین کر کے انسان کو اس کی طرف بلاتا ہے، پھر انسان کے نفس میں، اس کے پورے وجود میں اس کی دعوت خوش نما زہر بن کر سرایت کر جاتی ہے۔ لہٰذا اس زہر کے لیے تریاق بھی وہ درکار ہے جو پورے وجود میں سرایت کر سکے اور پھر جس میں حلاوت اور تاثیر بھی ہو۔ ایسا کوئی تریاق سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

''یہ قرآن اگر کسی کے اندر اتر جائے تو اُس کے باطن میں ایک انقلاب آ جائے، اور فرد کے اندر کا یہ انقلاب ایک بین الاقوامی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے''۔

محاذ پنجم

فرقہ واریت

ہمارا پانچواں محاذ جس پر ہمیں جہاد بالقرآن کرنا ہے، وہ فرقہ واریت، تشتت، انتشار اور باہمی اختلافات کا محاذ ہے۔ یہ عناصر وحدتِ اُمت کو صدیوں سے دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ انہی کے باعث دولتِ عباسیہ ختم ہوئی اور سقوطِ بغداد کا سانحہ پیش آیا۔ انہی کی وجہ سے بغداد کے گلی کوچوں میں اہل سنت کے دو گروہ دست بگریباں ہوئے، تلواریں بے نیام ہوئیں اور خون کی ندیاں بہائی گئیں۔ سلطنتِ ہسپانیہ کے زوال و انحطاط اور پھر کامل سقوط کے عوامل میں جہاں قبائلی عصبیتیں کار فرما تھیں وہاں اس تباہی میں فقہی و کلامی اختلافات کا عمل دخل بھی تھا۔ اور اب محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اختلافات سلطنتِ خداداد پاکستان کے لیے بھی روز بروز زیادہ سے زیادہ نازک اور خطرناک صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ماضی قریب میں بادشاہی مسجد کے ایک مبینہ واقعہ بلکہ محض افواہ پر معرکہ آرائی کی جو تکلیف دہ صورتِ حال بنی تھی، یہ چنگاری جنگل کی آگ بن سکتی تھی اور ہم میں سے ہر شخص اپنے طور پر اس کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ آگ ہمارے لیے کتنی ہولناک اور تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ فرقہ واریت کا بارود اب بھی ہمارے یہاں موجود ہے، کوئی شر پسند گروہ اس کو کسی وقت بھی دیا سلائی دکھا سکتا ہے۔ اس نازک صورت حال میں ہماری ملی و سیاسی زندگی اور ہمارے وطن کے مستقبل کے لیے جو خطرات مضمر ہیں، میں اس وقت ان کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ پھر یہ کہ فی الوقت صورتِ حال جس

ہلاکت خیزی کے دہانے تک پہنچی ہوئی ہے اس کے اسباب و علل کے متعلق بھی میں اس وقت کچھ عرض نہیں کروں گا۔ اِس وقت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس کا علاج صرف تشویش ظاہر کرنے سے تو نہیں ہو جائے گا' محض پریشان ہونے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا! اس کے لیے مثبت کام کرنا ہوگا۔ اس کے لیے بھی جہاد کرنا ہوگا اور اس جہاد کے لیے بھی قرآن ہی واحد تلوار ہے۔

اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست :

فرقہ واریت کے اس عفریت کا سر قلم کرنے' اس کا قلع قمع کرنے اور اس کو نیست و نابود کرنے کے لیے واحد تلوار صرف قرآن ہے۔ یہی سبق ہم کو سورۃ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے ابتدائی الفاظ میں ملتا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ تمام مفسرین اور تمام علماء عظام کا اس امر پر اجماع ہے کہ یہاں حبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہے اور یہ رائے متعدد احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں قائم کی گئی ہے۔ آیتِ مبارکہ کے اس حصے سے علامہ اقبال مرحوم نے جو کچھ اخذ کیا ہے وہ میں آگے بیان کروں گا۔ اس وقت میں اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا ایک شعر سناتا ہوں جو ہمارے موجودہ حالات پر منطبق ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ع

صوم ہے ایمان سے' ایمان غائب صوم گم

یعنی آدمی روزہ تو ایمان ہی کے تقاضے کے تحت رکھ سکتا ہے۔ (خاص طور پر موسمِ گرما کے روزے) جب ایمان ہی نہیں رہا تو صوم تو آپ سے آپ گیا! پھر اس کا التزام و اہتمام کیسے ہوگا؟ اگلا مصرع نہایت قابل توجہ ہے ع

قوم ہے قرآن سے' قرآن رخصت قوم گم

مسلمانوں کی ملّی اور قومی شیرازہ بندی قرآن سے ہے۔ قرآن درمیان سے ہٹ گیا یا آپ کی توجہ قرآن سے ہٹ گئی تو نتیجہ ایک ہی ہوا' یعنی وحدتِ ملّی کا شیرازہ بکھر گیا۔ اسے اقبال نے اس طرح تعبیر کیا ہے ع

یا مسلماں مُرد یا قرآں بمرد!

یعنی یا مسلمان مر چکا ہے یا (معاذ اللہ) قرآن مر چکا ہے۔ اقبال دراصل یہ کہہ رہے ہیں کہ قرآن تو زندہ و پائندہ ہے' لیکن مسلمانوں کی توجہ مر چکی ہے۔ قرآن سے ان کا شغف و التفات ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ علامہ مرحوم نے مسلمانوں کو چونکانے کی غرض سے یہ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔

عظمتِ قرآن کے بیان میں علامہ اقبال کے یہ اشعار بھی انتہائی قابل توجہ ہیں ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں　　زندہ و پائندہ و گویا ست ایں
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست　　عصر ہا پیچیدہ در آناتِ او ست

''اس قرآن کے بارے میں جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اُسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں! حقیقت یہ ہے کہ یہ محض کتاب نہیں ہے' کچھ اور ہی شے ہے! یہ ذاتِ حق سبحانہ و تعالیٰ کا کلام ہے لہٰذا اُسی کی مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی۔ اور یہ کتاب جیتی جاگتی اور بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی ہے۔ اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں۔''

لیکن مسلمانوں کا اس کتابِ الٰہی' اس ''ھُدًی لِّلنَّاس'' اس فرقانِ حمید' اس نسخۂ شفا کے ساتھ کیا سلوک ورویہ باقی رہ گیا ہے' اس کا نوحہ اقبال اس طرح کرتے ہیں ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست!　　کہ از یٰسین او آساں بمیری!

''لیکن افسوس کہ اے مسلمان! تجھے اس قرآن کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۂ یٰسین کے ذریعے موت کو آسان کر لے''۔

علامہ کے یہ اشعار بھی میں بارہا اپنی تقریر وتحریر میں پیش کر چکا ہوں جن میں انہوں نے بڑی دل سوزی کے ساتھ ہماری ذلت وخواری' ہمارے انتشار' ہماری آپس کی چپقلش اور تنازعات کی تشخیص بھی کی ہے اور علاج بھی تجویز کیا ہے ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی — شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ — در بغل داری کتابِ زندۂ

حضرت شیخ الہندؒ نے اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد پوری دنیا کے مسلمانوں کی دینی و دُنیوی تباہی و بربادی کا جہاں ایک سبب ''قرآن کو چھوڑ دینا'' قرار دیا تھا وہاں دوسرا سبب ''آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی'' بھی بیان کیا تھا۔ عوامی درسِ قرآن کے حلقے قائم کرنے کے عزم کے ساتھ ساتھ آپ نے اس ارادہ کا اظہار بھی کیا تھا کہ مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو ختم کرنے کے کام میں بھی وہ اپنی باقی زندگی صرف کریں گے۔ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ جو اِس روایت کے راوی ہیں' انہوں نے اس پر اس طرح تبصرہ فرمایا تھا کہ ''حضرتؒ نے ہمارے زوال وانحطاط کے جو دو سبب بیان کیے تھے' غور کیا جائے تو یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ ہمارے باہمی اختلافات اور باہمی جنگ و جدال کا سبب بھی قرآن کو ترک کر دینا ہی ہے''۔ ان دوا کابر کا اس پر کامل اتفاق نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح اور ان کے باہمی اختلاف کو ختم یا کم از کم ان کی شدت کو کم کرنے اور ان میں اعتدال پیدا کرنے کا واحد ذریعہ اعتصام بالقرآن ہے۔

علامہ اقبال نے اسے جس پُر شکوہ انداز میں ادا کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

از یک آئینی مسلماں زندہ است — پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است
ماہمہ خاک و دل آگاہ اوست — اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست

''وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملت کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے' ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں' ہمارا یہ وجود مٹی ہے! ہاں اس میں دل ہے' جس کی دھڑکن اس کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ (ہمارا قلبِ زندہ اور ہماری روحِ تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔) اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامو کہ یہی حبل اللہ یعنی اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔

اور فرماتے ہیں۔

چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو
ورنہ مانند غبار آشفتہ شو

''اے ملتِ اسلامی! اب بھی وقت ہے کہ تو اپنے آپ کو تسبیح کے موتیوں کی طرح قرآن کے رشتے میں بیندھ لے اور پرولے' ورنہ پھر اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ خاک اور دُھول کی مانند پریشان ومنتشر اور ذلیل وخوار رہ!''

میرا تأثر یہ ہے اور میں اسے تقریر میں بھی اور تحریر میں بھی برملا ظاہر کرتا رہا ہوں کہ ماضی قریب میں قرآن کی عظمت اور مرتبہ و مقام کا انکشاف جس شدت کے ساتھ علامہ اقبال پر ہوا شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو۔ علامہ مرحوم نے اپنی شاعری بالخصوص فارسی شاعری میں نہایت دل گداز' مؤثر اور تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جانے والے مختلف اسالیب سے ملتِ اسلامیہ کو جھنجھوڑا ہے اور اسے دعوت دی ہے کہ دین و دنیا کی فوز وفلاح چاہتے ہو تو قرآن کو تھامو۔ یہی تمہارے اتحاد اور تمہارے عروج کا واحد ذریعہ ہے۔ ان کا یہ شعر آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن!
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن!

''تو اگر مسلمان ہو کر جینے کا خواہش مند ہے' اس کی تمنا اور آرزو رکھتا ہے تو اچھی طرح جان لے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیات کی بنیاد قرآن پر قائم کرے''۔

حاصل کلام

حاصل کلام یہ ہے کہ ہمارے سامنے پانچ محاذ ہیں جن کے خلاف منظّم ہو کر جہاد بالقرآن کے لیے کمر کسنے کی ضرورت ہے۔ آپ میں سے اکثر لوگ جانتے ہیں کہ اسی جہاد کے لیے میں نے اپنا پروفیشن تج دیا۔ میں اپنی زندگی کے بہترین دن اسی کام میں لگا چکا ہوں۔ اب تو بڑھاپے میں قدم رکھ چکا ہوں۔ ع ''شادم بر عمر خویش کہ

کارے کردم'' ۔ الحمدللہ میری زندگی کے جو بہترین ایام تھے وہ اس جہاد بالقرآن میں بسر ہوئے ہیں ۔ میرے شب و روز اور میری صلاحیتیں اور توانائیاں دروسِ قرآن' تقاریر' خطباتِ جمعہ' انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے قیام' قرآن کانفرنسوں اور محاضراتِ قرآنی کے انعقاد' قرآنی تربیت گاہوں کے انصرام' قرآنی سلسلۂ اشاعت کے انتظام' قرآن کے پیغام پر مشتمل مطبوعات کی اشاعت اور ملک کے مختلف شہروں کے دعوتی دَوروں میں لگی ہیں ۔

اور الحمدللہ قرآن کا پیغام لے کر میں دوسرے ممالک میں بھی گیا ہوں ۔ صنم خانۂ ہند' عالم عرب' امریکہ اور یورپ میں چراغ روشن کیے ہیں ۔ لوگوں کو آمادہ کیا ہے کہ کمر کسیں اور اس جہاد بالقرآن کے لیے میدان میں آئیں ۔ ظاہر بات ہے کہ کام کے نتائج ظاہر ہونے میں وقت لگتا ہے ۔ آپ کے اسی شہر لاہور میں مَیں نے یہ کام چھ سال تن تنہا کیا' جبکہ کوئی ادارہ نہیں تھا' کوئی تنظیم نہیں تھی ۔ مطب بھی کر رہا تھا اور یہ کام بھی کر رہا تھا ۔ وہ جو حسرت موہانی نے کہا تھا ع ''ہے مشقِ سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی'' تو یہ دونوں چیزیں میرے لیے بھی جاری تھیں ۔ پھر ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن قائم ہوئی اور بقول اقبال ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں   یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

بہرحال میرا اور انجمن کا کام اسی جہاد بالقرآن کے گرد گھومتا رہا ہے ۔ آج میں نے اس پورے کام کو پانچ محاذوں کی شکل میں مرتب کر کے آپ حضرات کے سامنے رکھ دیا ہے' ورنہ یہ باتیں تو میں نے بارہا کہی ہیں ۔ میں ان کو مختلف موضوعات و عنوانات کے تحت اور مختلف پیرایوں میں بیان کرتا رہا ہوں ۔

آج مجھے آپ حضرات سے یہ کہنا ہے کہ رمضان المبارک کے جمعہ کی اس مبارک ساعت [۱] میں کچھ غور کیجیے' کچھ سوچیے' کچھ اپنے گریبانوں میں جھانکیے ۔ میں عرض کروں گا کہ ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم میں سے ہر شخص یہ معین (assess) کرے کہ میں قرآن کریم کے اعتبار سے کس مقام پر کھڑا ہوں ۔ کیا میں قرآن پڑھتا ہوں؟ قرآن پر غور و تدبر کرتا ہوں؟ قرآن سے مجھے کتنا شغف اور تعلق ہے؟ پھر یہ کہ قرآن کا جو حکم سامنے آ جائے کیا بے چون و چرا اُسے مان لیتا ہوں؟ کیا قرآن کے پیغام کو آگے پہنچانے کا کوئی ارادہ' کوئی عزم میرے اندر ہے؟ اس ضمن میں تن من دھن سے کوئی خدمت میں نے آج تک کی ہے؟ یہ خود احتسابی ضروری ہے ۔ انسان پہلے خود اپنا جائزہ لے' پھر فیصلہ کرے کہ بحیثیت مسلمان اس کو قرآن مجید کے جو حقوق ادا کرنے ہیں' اس کام کے لیے اس کے دل میں کتنی لگن' تڑپ' ولولہ اور حوصلہ ہے! اگر نہیں ہے تو شعوری طور پر اس کے لیے کوشاں ہو ۔ یہ بھی نہ کر سکے تو پھر اپنے ایمان کی خیر منائے ۔

میں نے ۱۹۶۸ء میں ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کے موضوع پر تقریر کی تھی ۔ اس میں قرآن مجید کے پانچ حقوق گنوائے تھے ۔ پہلا یہ کہ اسے مانا جائے ۔ دوسرا یہ کہ اسے پڑھا جائے ۔ تیسرا یہ کہ اُسے سمجھا جائے ۔ چوتھا یہ کہ اس پر عمل کیا جائے اور پانچواں یہ کہ اسے دوسروں تک پہنچایا جائے ۔ یہ تقریر مطبوعہ شکل میں موجود ہے ۔ ان حقوق کے حوالے سے اپنا محاسبہ خود کیجیے کہ کیا ہم ان کو ادا کر رہے ہیں! اگر نہیں کر رہے ہیں تو آج ہی یہ عزم کر کے اٹھیے کہ ہم ان شاءاللہ ان حقوق کو ادا کریں گے ۔

یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ میں نے قرآن مجید کے پانچ حقوق گنوائے تھے اور آج میں نے پانچ ہی محاذ آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں جو ہماری اپنی ملّت کی اصلاح اور اس کی دینی و ملّی زندگی کو سنوارنے کے لیے جہاد بالقرآن کے متقاضی ہیں ۔ یہ تو ہماری جدوجہد کا پہلا مرحلہ ہے ۔ ہمیں تو اس قرآن کی شمشیر بے زنہار' تیغ برّاں کو ہاتھ میں لے کر پورے کرۂ ارضی پر کفر' شرک' الحاد' دہریت' اباحیت' شیطنت اور ان کے ذریعے پیدا ہونے والے تمام امراض کا قلع قمع کرنا ہے ۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ "Physician heals thyslef" کے مصداق اس کام کو اپنی ذات سے شروع کیجیے ۔ پھر کمر کسیے کہ جہاد بالقرآن کے ذریعے پاکستان کے مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے اپنی بہترین توانائیاں' اپنی بہترین صلاحیتیں اور اپنے

(۱) واضح رہے کہ یہ خطاب رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ کے ایک مبارک جمعہ کے موقع پر کیا گیا تھا۔

بہترین اوقات وقف کریں گے' اور اگر اللہ توفیق اور ہمت دے تو پوری زندگی اسی کے لیے وقف و مختص رہے گی' از روئے آیتِ قرآنیہ:

﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ (الانعام)

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو نیز تمام مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسآئر المسلمین والمسلمات

❀ ❀ ❀